بہار کے نو چراغ

سید محمد حسنین

بھونر پوکھر - پٹنہ ۴
(بہار)

(خاکے اور افسانے)

سید محمد حسنین

(مطبوعہ آزاد پریس سبزی باغ - پٹنہ)

قیمت - ۱/۱۲/

سلسلۂ مطبوعات

اُردو سوسائٹی، پٹنہ

بار اوّل ایک ہزار ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۲ء

بھونڑ پوکھر - پٹنہ ۴ -

بہار

ترتیب

اُن حضرات کے نام

جنہیں

فلمی چہرے اصلی چہروں سے زیادہ اچھّے لگتے ہیں

پیش لفظ

پروفیسر سید محمد حسنین عظیم آبادی نے بہار کے سات لکھنے والوں کا تعارف کرایا ہے اور مجموعہ کا نام "بہار کے نوچراغ" رکھا ہے۔ ان میں ایسا کوئی نہیں ہے جس کو ہم سب کسی نہ کسی حد تک جانتے پہچانتے نہ ہوں، سوا ان دو[1] کے جن کا تذکرہ اس مجموعہ میں نہیں ہے!۔

تعارف کا انداز دوستانہ اور بے تکلفانہ ہے۔ ایسی بے تکلفی جو تکلف سے خالی نہیں۔ ہمارے ادب میں مرقع نگاری یا خاکہ نگاری کے بڑے دلنشیں نمونے ملتے ہیں۔ یہ مشغلہ بڑا دلچسپ ہے، اسی لئے اتنا مشکل بھی ہے۔ آپ کا کسی سے خوش یا ناخوش ہونا آپ کے لئے جتنا آسان ہے، اتنا ہی یہ مشکل ہے کہ آپ اس شخص کو میری پسند یا ناپسند کا موجب بنا دیں۔ جو شخص اس مرحلہ سے خیر و خوبی سے گذر جائے وہی فنکار ہے!

اُردو شعراء نے محبوب کی طرح طرح سے مرقع نگاری کی ہے، لیکن

---

[1] یہ دو حسب ذیل میں شامل تھے، اُس وقت راقم ان سے آشنا نہ تھا اس لئے ان کی پیشکش نہ ہو سکی:۔ جمیل مظہری، الیاس اسلامپوری، رضیہ رعنا، شمس مظفرپوری۔

کم سے کم میری طبیعت کبھی اس بات پر نہیں للچائی کہ ان کا محبوب میرا محبوب بن جائے ۔ ان کے محبوب میں انفرادیت نہیں ملتی ۔ ہمارے شعرا کا محبوب گوشت پوست کا نہیں، خوبصورت الفاظ اور نامعقول عادتوں کا ہوتا ہے میرا تو خیال ہے کہ یہ شعرا بھی اپنا محبوب پسند نہیں کرتے، لیکن کریں کیا، وہ تو ان کو وصیت یا وراثت میں ملا "ہوا ہوتا" ہے ۔

حسنین صاحب کے یہ ادبی خاکے بڑے دلچسپ ہیں، جذبات پر ان کی نظر خوب پڑتی ہے اور کل کی تعمیر میں ان سے کام بھی لیتے ہیں ۔ تحریر شاعرانہ بھی ہے اور شاطرانہ بھی ۔ بس محمد حسین آزاد کی تحریر سے ملتی جلتی ۔ بہار کے نواب نصیر حسین خیال بھی آزاد کے اسلوب بیان کے بڑے دلدادہ تھے ۔ حسنین صاحب نے چہرہ بھی اسی انداز کا باندھا ہے جو آبحیات کے مرقعوں میں ملتا ہے ۔ آج کل کے رنگ اور تقاضوں کو دیکھتے ہوئے تعجب ہوتا ہے کہ پروفیسر حسنین کو اس انداز بیان سے اتنا شغف کیوں ہے؟

مرقع نگاری میں دو باتیں خصوصیت کے ساتھ مدنظر رکھنی چاہئیں ۔ پہلی یہ کہ جس کا مرقع پیش کیا جائے، وہی پیش پیش ہو ۔ خود لکھنے والا رہ رہ کر سامنے نہ آجاتا ہو ۔ دوسری بات یہ کہ باتیں ایسی کہی جائیں جو مرقع و ماحول کے اعتبار سے جہاں تک ممکن ہو سکے صرف ہیرو میں ملتی ہوں، کسی اور میں نہیں ۔ مرقع نگاری ہاتھ کا کام ہونا چاہیئے، مشین کا ہرگز نہیں ۔ جب تک آپ اپنے ہیرو کو دوسروں سے واضح طور پر منفرد نہ کر سکیں گے، اس وقت تک نہ تو آپ کا کوئی قائل ہوگا اور نہ آپ کے ہیرو کا ۔ انشا پرداز کو یہ بات بھی

برابر پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ کہیں ایسا تو نہیں ہو رہا ہے کہ اس کے ہیرو میں کوئی مواد باقی نہیں رہا اور انشا پرداز اب صرف اپنی انشا پردازی میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ مرقع نگاری میں معمولی بات سے غیر معمولی بات ثابت کرنا اس سے کہیں بہتر ہے کہ غیر معمولی سے معمولی ثابت کرنے کی کوشش کی جائے۔

رشید احمد صدیقی

گذارش

آپ نے یہ اشعار سنے ہیں ؟

یہ کون مسکراہٹوں کا کارواں لیئے ہوئے
شبابِ شعر و رنگ و نور کا دھواں لیئے ہوئے
دھواں کے برقِ حسن کا مہکتا شعلہ ہے کوئی
چٹیلی زندگی کی شادمانیاں لیئے ہوئے

یہ روحِ کائنات کی اس مشہور نظم "شامِ عیادت" کے پہلے دو شعر ہیں جس کی واقعیت کی پردہ داری میں شاعر نے کوئی جھجک محسوس نہ کی اور کھلے بندوں بلا خوف اعتراف کرلیا :۔

"...... سنہ ۱۹۴۱ء میں میری زندگی ایک نئے واقعہ سے روشناس ہوئی ۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ جب میری زندگی میں ایک ایسی ہستی داخل ہوئی جس کی قربت نے سنہ ۱۹۴۲ء کے آخر میں ایسی شدید محبت کی شکل اختیار کرلی جس کا کچھ اندازہ میری ان نغموں اور غزلوں سے ہو سکتا ہے ...."

یہ فراق کی کسک ہے، اس فراق کی جو اُردو کے ایک بہت بڑے ناقد اور سخن فہم کے ان تین منتخب جدید، کامیاب اور حقیقی شعرا میں سے ایک ہیں۔ میرا مطلب پروفیسر کلیم سے ہے۔ موصوف نے ایوانِ شاعری میں حسن و معیار کے کئی زرکار و زرباف پردہائے حریر و پرنیاں چاک کر دیئے ہیں اور ادب و فن کے کتنے حسین و لطیف اور نازک بتوں کو توڑ ڈالا ہے۔ بزمِ نگارش میں ندائے کلیم کی گونج یوں سنائی دی تھی —— "وہ تین شاعر جنہیں میں حقیقی معنی میں شاعر سمجھتا ہوں حسرت، فانی، اور فراق ہیں"۔ یہ فروری ۱۹۴۲ء کی بات تھی۔ تقریباً پانچ سال بعد آلِ احمد سرور کی بصیرت نے اس اعجاز صداقت کو پردۂ بصارت پر اس طرح معکوس کیا:۔

"کلیم الدین بہت سے نقادوں سے زیادہ نئی باتیں، سوچی ہوئی باتیں اور خیال آفریں باتیں کرتے ہیں"۔

نئے اور پرانے چراغ کی روشنی میں سرور کی یہ تفسیر آبِ زر جیسی درخشاں ہے اور اُردو تنقید کلیم الدین کے .... پر، ٹھہریئے، نئے اور پرانے چراغ پر اپنا موضوع یاد آگیا۔ توبہ ہے، یہ آزاد تسلسل کا برا ہو، اختر اورینوی ٹھیک ہی کہتے ہیں:۔

"سوچنا آدمی کے لئے سب سے بڑی مصیبت ہے، بلکہ مصیبتوں کی جڑ، کوفت، پریشانی، اُلجھن، نیکی بدی کی ناپ تول، عمل اور مقابلہ کی شاخیں اسی ایک سوچ سے پھوٹتی ہیں ...."

اور اس وقت اسی سوچ نے آپ کو اور مجھے بھی کوفت اور اُلجھن کا شکار

بنا دیا۔ بات کون، قصہ کہاں کا اور ذکر کیسا؟ سوچنا واقعی تکلیف دہ مصیبت ہے۔
سرور کے نئے اور پرانے چراغ کے جھلمل نے ناگہاں سوچ کو روشن کر دیا اور
تحت و شعور کا خوابیدہ عنصر عمل شعور میں نمودار ہو گیا۔ جی میں آیا پرانے چراغ میں
تیل کہاں، نئے چراغ جلانے کے لائق ہیں ما دنیائے ادب نہ سہی دنیائے فسانہ
کو تو پر نور بنایا جا سکتا ہے۔ افسانہ نے دوسرے افسانہ نگاروں کی افراط
دکھائی اور اپنے افسانہ نویسوں کی تفریط سجھائی۔ آپ جانیے، دوسرے
ہوائی قلعہ اور شیش محل آناً فاناً کھڑے کر دیں اور ہم اس بے ثباتی
پر قائع کل من علیہا فان —— !! یہ مقام عبرت ہے اور وحشتناک
بدبختی بھی۔ پر اس خوش بختی کو کیا کہیے کہ قدرت کو نام نمود، شہرت و عظمت
اور حشمت و سطوت کے چراغ یہاں روشن کرنے تھے! شہزادہ کپیل وستو تخت
و تاج اور ملک و سلطنت سے منہ موڑ کر گوتم ہو گیا! اِھدنا الصراط المستقیم!!
اور عدم اقدام، عدم عزم اور عدم وجود کے مبارک خیالات اسی بدہیئت
سے عالم وجود میں آئے۔ بدھ کی وفات کو آج ڈھائی ہزار برس ہو رہے ہیں؛ پر
کپیل وستو کے گدھ، اشوک کے پاٹلی پتر، مغلوں کے عظیم آباد اور انگریزوں کے
پٹنہ میں وہی ثبات، وہی سکوت اور وہی جمود کا بول بالا ہے۔ یہ روایات اور
آب و ہوا کا ہی اثر ہے کہ نقش قدم کی گل ریزی تو کجا نسیم بہار شمیم ادب کی
بو بھی نہ پا سکی۔ تاریخ میں عزلت پسندی کی یہ مثال بے نظیر ہے، جو تھوڑے بہت
نیازمندانہ سے نکلے بھی، ذلت و رسوائی اور خوف و بدنمائی سے اپنے نام و نشان
تک کو مٹا ڈالا۔ بیدل، راسخ، سلیمان، یگانہ، اختر حسین، نصیر الدین وغیرہ

کو آج ہم ذرا اپنا کر تو دیکھیں ـــــ لعنت ہو اس سوچ پر! بات پھر اُٹھنے لگی۔ تو، نئے پُرانے چراغ دیکھ کر اپنے گھر کا اندھیرا سوجھائی دیا۔ عمل شعور میں تیز رہا تھا۔ بے مائیگی نے آہستہ سے اس میں مقابلہ بھی چھوڑ دیا۔ دیکھا تو افراط نہ سہی پر فقدان بھی یقیناً نہیں۔ موجود سامنے ہو، پھر مشہور روپوش کیوں؟ اور سوچ نے فوراً عمل اور مقابلہ کے وصال سے مجھے سرشار کر دیا۔ مشہور، معدوم اور موجود پر عظیم الدین احمد کا شعر یاد آ گیا۔ گل نغمہ میں مرحوم نے لکھا ہے

قلم کے زور سے موہوم کو مشہور کر دینا
یہ اس کا کام ہے جو آپ سے بیگانہ ہوتا ہے
جب ایسوں کی قلم کاری سے آ جاتا ہے کاغذ پر
رہے تا حشر عالم میں یہ وہ افسانہ ہوتا ہے

لیکن یہ 'بے گانگی' کی بحث نہیں، اس نے ہماری عزت و آبرو، نام و نمود سب کو بے آبرو کیا ہے۔ دوسرے اس سے اتفاق کریں۔ پر ہم اسے دور ہی رکھنا پسند کریں گے۔ غالب کو خوشی تھی۔

مارا دیار بار میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی میرے خدا نے میری بے کسی کی شرم

ہم تو لب بام کی ہوس اور تصور جاناں کئے بغیر اپنے ہی دیار میں بے کسی اور بے زبانی کی موت مرتے آئے، اب پھر یہ بیگانگی؟ ـــ

جنک پور کی کمان الفت، بودھ گیا کا شجر الوہیت، نالندہ کا دارالعلوم، پاٹلی پتر کا ایوان چوب، شاہ مخدوم کی سجدہ گاہ، شیر شاہ کا ملجا،

عظیم الشان کی فصیل، سرج کا قلعہ، اور انگریزوں کا گول گھر، جادو گھر، خدا بخش گھر بھی صنا دید پسندوں کے شوق و مذاق کو غیرت نہ دلا سکے۔ ایک پنچہ دو کانچ، دلی کا میتا کبابی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر محض کباب بنا کر حیات جاوید پالے اور اُجڑی نگری کے یہ چند لافانی نمائش گھر کی مومیائی بھی نہ بن پائیں۔۔۔۔؟

اُف رے زمانہ، ہائے ستم!

خوشی روتی ہے جس کو میں وہ محروم مسرت ہوں!

۔ ۔ ۔ لیکن آپ مایوس نہ ہوں ۔۔۔۔ کاروان چراغ تیار ہے۔ آئیے بہارستان بہار کی سیر کیجئے اور دھیان سے دیکھئے **ہوائی قلعہ** کی بلندی نہ سہی، شیش محل کی جگمگاہٹ نہ سہی پر چراغوں کی دودھ آمیز ضیاءیں گھرہائے ادب کا حسن، نور اور شعلہ ملاحظہ کیجئے۔

پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی

پیدائش صادق پور، پٹنہ سیٹی ۱۸۹۵ء

تعلیم ایم۔اے۔، ایم۔او۔ ایل۔

ہندوستان میں گیا ایک مشہور شہر ہے، جو یہاں کا ایک سب سے قدیمی
اور متبرک مقام مانا جاتا ہے۔ شہر سے تقریباً پانچ میل دور پھلگو ندی کے کنارے
یہاں ایک عظیم الشان مندر واقع ہے۔ حضرت بودھ کو اسی جگہ گیان کی جیوتی
ملی تھی۔ ہر سال ہندوستان اور ایشیا کے اکثر مقامات سے سیکڑوں جاتری
اس مقدس جگہ کی زیارت کو آتے ہیں۔ مندر پتھّر کا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ پورا
مندر ایک بڑی چٹان کو تراش کر بنایا گیا تھا۔ پہلے اس جگہ ایک بلند ٹیلہ تھا
اور سالوں سال کی کھدائی کے بعد اب یہ مندر بازیافت ہوا ہے۔ مندر کے
معبد میں حضرت گوتم کا ایک بھاری بھرکم سا مجسمہ ہے۔ مجسمہ کے پاس ایک
چراغ جلتا رہتا ہے۔ جس سے تیرہ و تار معبد سدا منور رہتا ہے۔ یہ چراغ دوسرے
تمام چراغوں سے پرانا اور بڑا ہے۔ آج سے تقریباً اٹھاون برس پیچھے
۱۸۹۵ء میں ہندوستان کے تاریخی محلّہ صادق پور میں یہ روشن ہوا تھا اور
آج اُجڑا دیار اور گیا گذرا عظیم آباد میں یہ اس طرح منوّر ہے، جیسے مندر کا دیا۔
ہندؤں میں بودھ گیا کا رتبہ بلند ہے اور بہار میں اس چراغ کا صوبہ کی ادبی
اور ثقافتی تاریخ میں اس چراغ کی اہمیت تو زیباسی ہے۔ آپ ان سے
ملیے، یہ ہیں:—

جن پر اُچٹتی ہوئی نگاہ ڈالتے ہی آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ گویا مولانا عبدالحی نے داڑھی چھوٹی کر کے گاندھی ٹوپی پہن لی ہے۔ شکیل صورت، جمیل رنگ، ستوان ناک اور بلند پیشانی، بولتے ہوئے لب اور سُرخی مائل چہرہ، آنکھیں نشیلی اور نیم دائرہ نُما کشتی عینک سے ڈھکی ہوئی۔ قد اوسط ہے اور لانبے ہاتھ چست شیروانی پر زیادہ تر نظر آتے ہیں۔ جوانی میں ترکی ٹوپی پہنتے تھے جب چہرے پر بھی سُرخی کی چھوٹ تھی۔ بلقان و یونان کی جنگ کے بعد سے ترک کر دی، اب سپید کشتی نما ٹوپی استعمال کرتے ہیں۔ کل ہند مومن کانفرنس میں یہ ہیئت دیکھتے ہی سب کے سب استقبال کو لپکے۔ معلوم ہوا کہ انصاری نہیں تو کوئی جیسے فوراً چھنٹ گئے ــــ

نام، لقب، تخلص، مذہب، قومیت سب کچھ لفظ "مُسلم" پر ختم ہو جاتا ہے۔ ہزاری باغ کالج میں عربی کا درس دیتے ہیں۔ طلبا "مولانا" سے یاد کرتے ہیں۔ عظیم آباد وطن ہے۔ علم و ادب، حکمت و فلسفہ کی کرسیوں سے نکھرتا اور سنورتا آتا ہے اور ساٹھویں سال کے ریاض نے آج محمد مسلم کو شعبۂ عربی و فارسی کی کرسی عنایت کی ہے۔ ہندوستان کی اولین قومی جنگِ آزادی ان کے آبا و اجداد نے شروع کی تھی۔ برطانیہ سرکار نے وہابی تحریک کو آنا فاناً کچل ڈالا اور پروفیسر مسلم کے اعزہ و اقارب ادھیڑ دیے گئے۔ جو رہے وہ شعیدہ مرے اور جو بچے وہ مفرور رہے۔ یہ اپنے والد ماجد کی علوم

بھی محروم رکھے گئے۔ رشتہ کے تمام لوگ تحریک کے بانی اور قائد تھے۔ غلامی قبول نہ کی اور سب کچھ چھوڑ کر ہندوستان سے ہجرت کر گئے۔

افسانہ نگار ہوتے ہوئے بھی پروفیسر مسلم خود کو جدید ادب سے قطعاً بے تعلق بتلاتے ہیں۔ قدماء کا احترام کرتے ہیں۔ اقبال ان کا محبوب شاعر ہے، شبلی محبوب مصنف اور پریم چند محبوب افسانہ نگار۔ رجعت پسند ہیں۔ جدید شعراء خصوصاً شعراء سے زیادہ متاثر نہیں۔ ترقی پسند نظریات کی قدر کرتے ہیں پر ترقی پسند ادب سے دل برداشتہ ہیں۔ گفتگو کیجئے، اپنے نظریئے پیش کیجئے، آپ کی باتوں کو بغور سنیں گے۔ لیکن اپنے خیالات کی صداقت پر ایمان رکھیں گے اور متاثر ہرگز نہ ہوں گے کہتے ہیں اور ڈنکے کی چوٹ سناتے ہیں "جسے لوگ ترقی پسند ادب کہتے ہیں میں تپ دق کے جراثیم سمجھتا ہوں۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ ایک بار خود ان جراثیم کے شکار ہو گئے اور دبی زبان سے اعتراف بھی کر لیا۔ یہ بات ۱۹۴۶ء کی ہے۔ قصہ اس کا یوں ہے ـــــ

بزم ادب کی سالانہ تقریب میں کرسی صدارت پروفیسر محمد مسلم کے سپرد تھی۔ بہار اور خصوصاً پٹنہ میں بزم ادب کا وجود ایک چھوٹے دبستان سا ہے۔ آپ نے ہندوستان کے اکثر اینگلو انڈین انگریزی روزناموں میں اس نوع کا اشتہار دیکھا ہوگا۔

'BRITAIN LEADS AND THE WORLD FOLLOWS

اسے سچ مانئے کہ بزم ادب اگر پٹنہ کے عوض لاہور میں ہوتی یا پٹنہ کالج صوبہ پنجاب کا کالج ہوتا تو بزم اپنی ہر بہی کا اعلان اسی نمونے پر مشتہر کراتا۔ صرف اسم بدل جاتا ورنہ جملہ

بالکل یہی رکھا جاتا۔ اپنی سالانہ تقریب کے موقع پر یہ ادارہ خوب ہی تزک و اہتمام، جدّت و ندرت اور آن بان کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ صوبہ کی چیدہ ہستیوں کے علاوہ دنیا ادب کے چند برگزیدہ ہستیوں کو بھی دعوتِ شرکت دی جاتی ہے، اور ذی علم و اہلِ فن ناظرین کے روبرو صوبہ کے کم سن و کم گو اہلِ قلم کی پیشکش ہوتی ہے۔ میر تقی مرحوم کی غالب خستہ جاں پر پیشین گوئی سچی نکلی۔ یہاں بھی معزز سامعین اکثر نونہالوں کو اس قسم کی اُمید بخش دادِ سخن عنایت کرتے ہیں۔ ارباب بزم اسے سن کر محظوظ ہو جاتے ہیں اور نونہالانِ ادب فرطِ طرب سے سرشار۔ اُمیدیں بندھتی ہیں اور تکمیلِ تعلیم تک "ہر نو خیز" سے یہی اُمید استوار نظر آتی ہے کہ یہ کچھ کرے گا کہ اچانک یہ خبر ملتی ہے" وہ نوجوان شاعر کلاتھ انسپکٹر بن گیا، وہ افسانہ نویس ترقی کر کے سپلائی آفیسر مقرر ہو گیا اور اس ادیب نے راشن شوپ کھول دی۔" کاش یہ دردناک انجام واہی تباہی یکنے ہی تک ہوتا! اے ملک تیری کمبختی پر آنسو اور اے ادب تیری بدبختی پر آٹھ آٹھ آنسو —— !!

ہاں تو ۱۹۴۶ء میں پروفیسر محمد مسلم کرسئ صدارت پر رونق افروز تھے۔ لوگ انہیں صوبہ کی متبرک و ممتاز شخصیت تصوّر کرتے ہیں۔ حاضرین کی آنکھیں ان پر بصد احترام و اشتیاق لگی تھیں۔ تمثیل کے بعد مناظمہ کا دور رہا اور حسبِ قاعدہ نوجوان شعراء و دیگر اساتذہ نے اپنا اپنا کلام سُنایا۔ خاتمہ پر موصوف کی باری آئی۔ سُنا نے کھڑے ہوئے شاندہل کی ترنّم ریز فضا کا اثر تھا یا کوئی ناگہانی جولانی کا نتیجہ کہ انہوں نے اپنی غزل کی ابتدا، حفیظ جالندھری و عندلیب شادانی کی سحرآور لے میں کی۔ مقطع پڑھا اور پہلا ہی مصرعہ اس طرح توڑ جوڑ کر مکمل موسیقی بناتے

سُنایا، جیسے شمشاد بیگم اور فیاض خاں دونوں نے ساتھ مل کر گانا شروع کر دیا ہو سبھوں کو حیرت ہونے لگی۔ خدا کی قدرت، ثانی مصرعہ پر ہی مائیکروفون، فیل کر گیا اور بجتی ہوئی گونجتی سی آواز اچانک فنا ہو گئی۔ لوگ کسمسائے، آوازیں اُبھریں اور سرگوشیاں شروع ہونے لگیں۔ مائیک لاکھ تدبیر پر بھی ٹھیک نہ ہوا مجبوراً بے لاؤڈ اسپیکر کے بغیر ہی سُنانے لگے۔ آواز میں بلند آہنگی نہ تھی، موقع کی نزاکت تاڑ گئے اور باقی اشعار تحت لفظ ہی پڑھا —— میں پاس تھا، چپکے سے بولا۔ "کمبخت ترقی پسند ادب کے جراثیم یہاں بھی موجود ہیں" فوراً ڈانٹا "خاموش ہو" پھر بعد میں اقرار کیا "بھائی! لونڈوں خصوصاً کالج کے لڑکوں کی صحبت میں اسی لئے میں شرکت سے بھاگتا ہوں، واللہ مجھے علم نہ تھا کہ میں غزل ترنم سے سنا رہا ہوں"

محمد مُسلم نے تاریخی اور قدیمی مدرسہ صادق پور میں رب یسّرا ولا تعسرا کہا اور محمڈن اینگلو اسکول میں ثمرت بالخیر پڑھا۔ کالج کی زندگی بی۔ این۔ کالج پٹنہ سے شروع ہوئی۔ متعلّموں میں نمایاں رہے اور خوب چمکے۔ مشرق میں پریسیڈنسی کالج کلکتہ تک دوڑ لگائی مغرب میں اورینٹل کالج لاہور تک اور ایم۔ اے۔ ایم۔ او۔ ایل کی ڈگریاں ملک کی ان قدیمی یونیورسٹیوں سے حاصل کیں۔ فطری رجحانات اور شستہ مذاق پر علمیت کا صیقل ہوا۔ اوائل عمری میں انہوں نے بڑی لیاقت دکھائی۔ طوطیِ ہند علامہ سیّد علی محمد شاد عظیم آبادی جن کی غزلیں آج بھی باہر والے بڑی سہولت سے درآمد کر لیتے ہیں، انہیں اپنا شاگرد

ارشد کہتے تھے اور آج عظیم آباد اسکول کے واحد نمائندہ محمد مسلم ہی تصور کیے جاتے ہیں۔

پروفیسر مسلم کو شاعری سے زیادہ نثر سے تعلق رہا ہے اور ذوق و استعداد نے اس شعبہ میں انہیں بڑی شہرت و عزت دی ہے۔ ہندوستان کے معیاری رسالوں میں ان کی تحریریں شائع ہوا کی ہیں۔ آج سے تیں اڑتیس برس پہلے جب مخزن الناظر اور ادیب ہمارے ادب و شاعری کے عکاس تھے مسلم کے علمی و تاریخی مقالے اور افسانے ہندوستان کے اس بلند پایہ جریدہ میں بڑے اشتیاق سے پڑھے جاتے تھے۔ فارسی میں انہوں نے مختلف موضوعات پر کئی چھوٹے چھوٹے کتابیں تصنیف کی ہیں اور نیرنگ خیال، عالمگیر، ساقی، ندیم، معاصر وغیرہ میں اپنے افسانوں کو شائع کرایا ہے۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ ہنوز یہ اپنے افسانوں کا کوئی مجموعہ نہ شائع کرا سکے اور نہ خود کر سکے۔ ایک بار اصرار کیا کہنے لگے "کل من الیہ فان" ——

مصنّف کا وارث

"میرے ماموں لکھ پتی تھے۔ اور اپنی ساری دولت مجھے لکھ گئے!" ہمارے
خاموش رفیق سفر نے زبان کھولی۔ حیرت سے ہم نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا میل
سے چیکٹے کنارے کی ترکی ٹوپی، شیروانی کی گھسی ہوئی آستینیں، میلا پاجامہ، پرانے
شوز اور انٹر کلاس کا سفر۔ وہ ہماری حیرت کو سمجھ گیا۔ "جی ہاں اپنی جائداد کا پیسہ
پیسہ مگر (ٹھنڈے سانس کے ساتھ) دولت بھی ہمیشہ رحمت ہی نہیں ہوتا"
"بجا ہے"
"وہ اہل قلم تھے اور درجنوں کتابوں کے مصنف"
"خوب! ان کا اسم گرامی کیا تھا؟ شاید ہم نہ آشنا ہوں؟"
"استغفر اللہ! کوئی آشنا نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ سمجھتے ہیں ان کی کوئی

پبلک کے ہاتھوں تک پہنچی ؟ آپ ذرا سننے جائیں یہ تصنیف ہی تو ہماری مصیبتوں کی جڑ ہے، یہ ان کی کمزوری کیا جنون کہا جائے تو زیادہ صحیح ہو گا۔

" دولت ان کو بھی ایک ماموں ہی سے غیر متوقع طور پر مل گئی تھی ۔اس سے پہلے وہ برسوں کتب خانہ عام کے کتاب دار تھے اور کتابیں اُن کے دل و دماغ میں رچ گئی تھیں ۔میری اور شاید آپ حضرات کی سمجھ سے بھی باہر ہے کہ ایک ۳۷ برس کا جوان یک بیک اتنی بڑی دولت چھپّر پھاڑ کر اس کے سر پر جا پڑے اور کبھی اس سے لطف اندوز نہ ہو۔ کبھی قرینہ کا ایک جوڑا نہ پہنے ۔آپ کو شاید یقین نہ ہو، وہ مرے ہیں تو اثاثہ میں ایک چاندی کی گھڑی تک نہ پائی گئی ۔ اس دولت سے جو کچھ انہوں نے مصرف لیا صرف یہ تھا کہ شہر سے شہر اور محلہ سے محلّہ کرایہ کا گھر بدلتے رہے ۔پندرہ بیس من کتابیں ایک مٹکا روشنائی ایک مربع میل بھر کاغذ، دو صندوق قلم اور جاذب اکٹھے کر لیے اور کتابیں لکھنا شروع کر دیں۔ دن رات خواہ کوئی موسم ہو اس کے سوا کوئی مشغلہ نہ تھا۔ قریب ترین قرابتمندوں میں صرف ایک بہن تھی، میری ماں اور میں اپنی ماں کا اکلوتا سلسلۂ ذکور میں چچیرے بھائیوں کی اولاد سے صرف ایک لڑکا تھا ۔مگر وہ ماموں جان کے پاس لایا گیا تو خبر نہیں کیوں "دُور دُور، دفع کرو، لے جاؤ میرے سامنے سے!" کا غل مچا دیا۔ پھر بیچارے کو کبھی سامنا کرنے کی ہمت پڑی نہ ماموں نے کبھی اسے یاد کیا۔ اب میدان میں صرف میں رہ گیا تھا ۔میری والدہ نہایت ہوشیار اور موقع شناس عورت تھیں۔ بھائی کے دل میں میرے گھر جگہ بناتی رہیں اور مجھے بھی اس اسی قسم کی تعلیم و تربیت ملتی رہی ۔

ماموں جان کچھ عجیب ہیئت و فطرت کے بزرگ تھے۔ اب میں سوچتا ہوں تو اس سے متوحش اور خوفزدہ ہو جانے پر حیرت نہیں ہوتی۔ ان کے سر کے بال جدا جدا کھڑے صرف کن پٹیوں پر۔ گدی اور چندیا خالی۔ ہو بہو کچھڑے کی جاپانی گڑیا۔ گال پچکے۔ ناک ننھی سی، اوپر کا لب بڑا اور موٹا، چہرہ زردی مائل، کرنجی آنکھیں عینک کے پیچھے، ہر وقت شب خوابی کے انگریزی طرز کے کپڑے ڈھیلا پائجامہ، ڈھیلا کوٹ، نکی کیپ، باہر اگر نکلتے تو بند گلے کا گھٹنوں سے چھ انچ نیچا لمبا کوٹ، ایڑیوں تک لٹکتی ہوئی ڈھیلی ڈھالی پتلون، سر پہ ایک بڑی سی اور بیسر ہیٹ۔

وہ ہمیشہ کسی مشہور مصنف یا شاعر کے مولد یا مدفن پر یا اس کے آس پاس بود و باش اختیار کرتے، آخر میں وہ آگرہ کے اس مکان میں سکونت پذیر تھے، جس کی زمین پر لوگوں نے بتا دیا تھا مرزا غالب مرحوم پیدا ہوئے تھے ان کی تمام تصانیف مطبوعہ اور قلمی جن میں سے اکثر ان کے عقیدے میں مرزا کے دست خاص کی تحریریں تھیں، ان کے کتب خانہ کی زینت تھیں۔ قرآن مجید سے لے کر کریما اور قواعد بغدادی تک معروف و غیر معروف عربی و فارسی نظم و نثر کے قلمی تبرکات پر انہیں ناز تھا، اور ان پر منہ مانگی قیمت دیدیا کرتے۔ ایسے سوداگروں اور عیاروں کے پیٹ خوب بھرے۔

اس طرح قدیم مصنفوں کی ایک روحانی فضا تیار کر کے وہ خود لکھنے بیٹھے۔ وہ عرصہ تک سرسید اور حالی کے عاشق رہے۔ ان کا مقصود بھی قوم کی اصلاح تھا۔ مگر اپنے برے پیمانے پر جو سرسید اور حالی کو خواب میں بھی خیال

نہ گذرا ہوگا۔ دینِ حق، راہِ راست، درسِ تاریخ، روحِ حیات، منزلِ آخر، اور دوجنوں کتابیں نثر میں، تازیانہ، دیوِ تعصب، صورِ اسرافیل، ندائے غیب اور بیسیوں مجموعے نظم میں اپنے صرفِ خاص سے چھپوائے"

میں نے ابھی اس کو گھورا ہی تھا اور کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ میرا مطلب سمجھ گیا۔

"ان میں کوئی کتاب آپ کی نظر سے نہیں گذری نہ اشتہار دیکھا؟ کسی نے نہیں دیکھا نہ کوئی کتاب پڑھی۔ یہاں تک کہ اخبارات اور جرائد نے رسید کے سوا کسی پر تنقید کی بھی پروا نہ کی۔ بھاڑے پر تقریظ لکھنے والوں نے بھی جواب دیدیا، اپنے حسابوں سے وہ نصف صدی قبل از وقت پیدا ہوئے تھے۔ وہ صبر سے وقت کے منتظر تھے۔ اکثر مجھ سے کہا کرتے عزیزم وقت آئے گا جب ان خیالات کی قدر ہوگی۔ آج اقوام بے گڈریئے کی منتشر بھیڑیں ہیں۔ مذہب، خون، رنگ، ویش کے رکشوں نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ اشتراکیت جمہوریت، قیصریت، وطنیت اور سرمایہ داری کی شکلوں میں فرعونیت، جبری بھرتی، جبری مزدوری، جبری قانون، جبری محصولات کی شکلیں۔ جب چنگیزیت، بغاوت، جنگ، قحط، وبا، طلاق کے عذابوں سے دنیا بھی تو تنگ آئے گی، اس وقت میرے معروضات سمجھ میں آئیں گے ..... میں صاف دیکھ رہا ہوں (آنکھیں بند کر کے) سیاہ بادل افق پر جمع ہو رہے ہیں"۔ حضرت ٹھنڈی سانس کھینچ کر چپ ہو جاتے ہیں، گویا۔ ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

کبھی وہ مزدور سے خطاب، یا مذبوح انسانیت، اپنی نظمیں خوش الحانی سے سُنانے کا مجھے حکم دیتے اور عطف و اضافت میں شتر گربگی کے سبب سے میں اٹکتا یا ناموزوں پڑھتا تو وہ مطبوعہ بیاض مجھ سے لے کر خود گھڑ گھڑاتی آواز سے یوں پڑھتے، جیسے کوئی تخت گھسیٹ رہا ہو۔

اکثر وہ آنکھیں بند کئے یوں تقریر فرمانے لگتے:۔

"بیٹا سدّن (سعدالدین) میں دیکھ رہا ہوں حملہ آوروں کو، ان کی کمین گاہوں کو، خوش آشامیوں کو، مظلوم مدافعوں کو، اُن کی بے دست پائی، پھر انقلاب کو۔ یہ فتنہ برسات کے پتنگوں اور ٹڈیوں کی طرح دنیا کے ایسے گوشے سے اُٹھ رہا ہے، جس کا کسی کو وہم نہیں، اور دیکھتے دیکھتے روئے زمین پر چھا جاتا ہے۔ تاریخ عالم بدلی جاتی ہے، نہیں مٹی جاتی ہے۔ نیست و نابود ہوئی جاتی ہے۔ اور نئی تاریخ اور جغرافیہ کی بسم اللہ ہو رہی ہے۔

مجھے دیکھو، میں کیا چاہتا ہوں۔ قوم کو نہیں۔ قوموں کو راہ راست پر لانا۔ سدّن میں انہیں راستہ بتا سکتا ہوں۔ نہیں بتاؤں گا۔ اور امن و صلاح کی اس بہشت میں پہنچا کر چھوڑوں گا، جہاں دودھ اور شہد کی ندیاں بہ رہی ہیں"۔

"غرض وہ مجھے پاس بٹھا کر گھنٹوں اقوام۔ امن و اصلاح و فلاح کی بکواس کیا کرتے۔ اماں کے حکم سے ہر اتوار کے اتوار تفریح و دلچسپی سے مُنہ موڑ کر بہترین لباس میں صاف ستھرا آراستہ ہو کر اپنے سنکی ماموں کی خدمت میں حاضر ہوا کرتا اور تمام دن ان کا بڑا خفیف بنا رہتا۔

رفتہ رفتہ میں اُن کی بکواس کا خوگر ہو گیا۔ اکثر خوشامد سے ہفتہ کے اور

دن بھی اُن کے پاس جا نکلتا، یا بھیجا جاتا تو زیادہ خوش ہوتے۔ وہ سمجھنے لگے تھے یا یقین دلایا گیا تھا کہ دنیا میں اُن کو کوئی سمجھا ہے تو میں، میرے سوا دنیا میں اور کوئی ایسا بدنصیب تھا ہی کون جو اُن کے پاس پھٹکتا۔

دنیا میں کہیں کسی شخص میں کوئی حرکت دیکھ پائی، اخبار میں کسی موجد مصلح، مصنّف، شاعر، مدبّر، مفکّر، جانباز کا ذکر پڑھا اور اپنی تصانیف کی چند جلدیں اُس کے پاس بھیجدیں، اور اصلاح اقوام وملل پر تبادلہ خیالات کے لئے گھر پر دعوت دی۔ ان میں سے نصف سے تو کوئی جواب ہی موصول نہ ہوتا اور کسی نے رسید دی تو آیا نہیں۔ آپ کو شامتِ اعمال سے کبھی اُن کے کمرے میں داخل ہونے کا اتفاق ہوتا تو دیکھتے کوچوں اور کرسیوں پر، سر ——، راجہ ——، نواب ——، دلیش بندھو —— رئیس الاحرار ——، ڈکٹیٹر ——، صدر جمہوریہ ——، وزیر الممالک —— کے نام لکھی ہوئی چٹھیوں کا پشتارہ، فرش پر پرزوں، اخبارات، رسائل کا ڈھیر، آتش دان پر چائے کی طشتری، پیالی، میز پر آدھے کھائے توسں کے ریزے، داہنے بائیں کرسیوں کے اُوپر نیچے کتابیں، اور ان کے درمیان بیٹھے یہ قلم گھسے جا رہے ہیں اور کاغذ رنگے جاتے ہیں۔

اس درمیان میں کبھی مجھے دیکھ کر کاغذ پر نظر جمائے بڑبڑاتے خیال جیسا ٹھوس ہو ویسا ہی طرز بیان چاہیے کیوں؟ اور خیریت یوں پوچھتے۔ کہو عصر جدید کا کیا حال ہے؟ یعنی میں کیسا ہوں۔ مجھے وہ عصر جدید کا نمونہ بنا رہے تھے۔

ماموں جان اپنے خیالات کا اظہار مجھی سے کیا کرتے۔ دوسرا کوئی ان کے پاس بھٹکتا ہی نہ تھا اور کوئی مل بھی جاتا تو اس سے کھل کر باتیں نہ کرتے یا کر نہ سکتے۔ مجھے اپنی کل تصانیف عنایت فرمائیں۔ چار چار سو صفحوں کی ایک ایک جلد، نہایت خوبصورت بندھی ہوئی اور بہترین چھپی ہوئی۔

آخری سے پہلی بار جو میں اُن سے ملا ہوں تو وہ کمزور اور کچھ بیمار تھے ایسی علامتیں میں زیادہ غور سے دیکھا کرتا۔ کم سے کم اُن کی کتابوں سے زیادہ توجہ اُن پر صرف کرتا تھا ــــ فرمانے لگے:-

"سدن خوب آئے۔ بیٹے یہ ہے میری آخری تصنیف۔ اندھی اور بہری اقوام عالم سے میرا آخری خطاب۔" ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ قوم کی بے حسی اور اپنی آواز کی ناشنوائی پر اکثر رویا کرتے۔ "سدن میں اب سوچنے لگا ہوں کہ موجودہ نسل کی بے حسی پر میں اعتدال سے زیادہ سخت رہا ہوں۔ ضرورت ذرا ہمدردانہ لہجے، پیار چمکار اور کچھ مدھم روشنی کی معلوم ہوتی ہے۔ میری زبردست برقی شعاعیں ان کی آنکھوں کو چکا چوند کرتی ہیں۔"

اس کے بعد عمر میں پہلی بار اپنی ناکامی کا اقرار کیا۔ میں سمجھ گیا اب کوئی چیز اُن کو زندہ رکھنے والی باقی نہیں۔ چند منٹ کی خاموشی کے بعد رُک رُک کر بولے:-

"سدن میں احمق تھا۔ تمام عمر بیکار بکواس میں گذار دی۔ خدا جانتا ہے اب تک خود فریبی میں مبتلا رہا۔ کبھی کبر نفس اور غرور باطن سے بری نہیں رہا۔" یہی جملے دُہراتے دُہراتے رُکے، اور کانپتے ہاتھ سے آخری خطاب، میری طرف

بڑھائی۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے تعظیم کے ساتھ لے لی۔ یہ ساری جزئیات ذرا ذرا مجھے اس لئے یاد ہیں کہ میں نے گھر پہنچ کر اماں کے سامنے ان سب کو دہرایا بلکہ ایکٹ کیا تھا۔ خیر ماموں نے کہا: "اب یہ کتاب ('یہ' پر زور دے کر) لیجاؤ اور پڑھو۔ یہ میرے آخری الفاظ ہیں۔ میں اپنی تمام جائداد تمہارے لئے چھوڑے جاتا ہوں۔ خدا کرے میری کامیابی، تم، دیکھو" وہ کھانسنے لگے۔

آخری بار جو آخری زیارت کو میں بلایا گیا ہوں، مجھے خوب یاد ہے، باہر اُن کی اماں کی چھوکری سے حسب معمول مذاق کرتا، ہنستا بولتا اندر گیا۔ اُن کی نبض تیزی سے ڈوبی جاتی تھی، مگر غریب نفس نے آخر دم تک پیچھا نہ چھوڑا۔

انتہائی نقاہت سے "اُسے ــــ پڑھا؟"

"جی، میں تمام رات بیٹھا پڑھتا رہا اور ختم کر کے اُٹھا" میں نے بلند آواز سے کان میں کہا۔

ماموں جان بولے: "گو یہ آخری ہے مگر بہترین اور قوی ترین، شیریں ترین"۔ اُن کے لبوں پر تبسم نمودار ہوا، جو اُن کے لئے انوکھی چیز تھی۔ میرا ہاتھ دبانے کی کوشش کی اور چپکے ہو گئے۔ جن الفاظ سے وہ خوش ہو گئے تھے میں نے پھر دہرائے۔ "سب سے عمدہ، دلیرانہ، زبردست تصنیف" مگر انہوں نے جواب نہ دیا۔ دروازے کے پاس سے چھوکری کی صرف کھکھی کھلکھل کھکھی کھلکھل ہنسی میں سن رہا تھا، اکثر وہ اُن کی عجیب حرکات کا میرے سامنے مذاق اُڑایا کرتی تھی، کمبخت نے اس وقت بھی یہ جرأت کی۔ سچ ہے دولت سب کچھ خرید سکتی ہے۔ مگر سچی محبت اور عزت نہیں خرید سکتی۔

ماموں کے چہرے پر جو نظر کی تو آنکھیں پتھرا چکی تھیں، منہ کا ڈھل چکا تھا مگر لب پر وہ آخری تبسّم موجود تھا۔ مرے تو ناکام، نامراد، محرومِ تمنّا، مگر یہی آخری تبسّم اُن کی عمر بھر کی کش مکش، محبت و مشقت اور خیالی قربانیوں کی قیمت تھی۔

آپ دل میں سوچتے ہوں گے کلمہ، تبلیغ، یقین؟ مگر آپ ان کی کتابیں پڑھتے تو سمجھ لیتے کہ وہ اصلاحِ عالم کی تعلیم کے ساتھ ایک خاص مجموعہ مذاہب کے مبلغ بھی تھے۔ ایک معجون مرکب کی سی چیز تھی اور اپنے طور پر اس کا استعمال کر لیا کرتے تھے، سو کر چکے ہوں گے۔

میرے اور زیادہ ارماں کے جوش و خروش سے بڑی دھوم سے جنازہ اُٹھا، پختہ قبر بنی۔ فاتحہ چہارم سے فرصت ملی تو وصیت نامہ کی تلاش ہوئی میزوں کی درازیں، الماریاں، کتابیں، صندوق، سب اُلٹ ڈالے، گھڑے پھاڑ ڈالے، دلے توڑ ڈالے، دیواروں کا پلاسٹر اور فرش ٹھونک ٹھونک کر خلا کا اندازہ لگایا اور اُکھاڑ ڈالا۔ باغ کا چپّہ چپّہ کھود ڈالا، وصیت نامہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ نوکر، ماما، چھوکری سب نے شہادت دی کہ سرکار نے دستاویز کی قسم کی کوئی چیز لکھی تھی ضرور مگر کہاں رکھی، کسی کو علم نہیں۔

پانچویں روز ایک وکیل صاحب تشریف لائے اور ایک پُرانا وصیت نامہ نکالا، جو مرحوم نے اماں سے ذرا سی ناراضگی کے موقع پر تحریر کیا تھا اور اسی پچیرے دو چچیرے بھائی کے بیٹے کے حق میں تھا، جسے کبھی وہ دور دفان کر چکے تھے، جو ایک منٹ ماموں جان کی گفتگو سننے کی مجال رکھتا تھا نہ تحمّل، میں ان کی صبر آزما کوس کی کوفت اٹھانے پر مغلوک الحال پڑا پھرتا ہوں اور وہ سانڈ بنا

بلا در دسر گلچھرے اڑاتا رہا۔ شراب جوئے عورت میں سن بلوغ سے لے کر ۱۳ سال
کی عمر کے اندر دس سال میں ساری دولت پھونک دی۔ اب تین سال سے
پاگل خانے میں ہے۔

..میں فلاکت میں مبتلا ہوگیا۔ ورثہ کے خواب کے سوا میں نے کوئی صلاحیت
حاصل نہیں کی۔ میری زندگی کے سارے نقشے موقوف تھے، ماموں کی موت پر، جب
میں واقعی زندگی شروع کرنے کو تھا۔ جیسے تیسے میں کسی طرح دن کاٹتا رہا۔ اب جو عام
مالی تنگی اور کساد بازاری کے دن آگئے اور پریشانیوں میں اضافہ ہوگیا میں نے
ضروری حاجتوں کے لئے غیر ضروری اثاثہ فروخت کرنے کا ارادہ کیا۔ ان میں سب
سے نمایاں ماموں کی تصانیف کی خوبصورت جلدوں کی قطاریں تھیں جن کو
کوئی ٹکے کو نہیں پوچھتا، ٹڑیاں باندھنے کو بھی نہیں۔ ماموں سے میں نے وعدہ
کیا تھا، کہ عمر بھر ان کو جدا نہ کروں گا۔ مگر ہوا کیا؟ وہ آخری کتاب فرش پر ہی
پڑی رہی۔ جل کر لگائی جو میں نے ٹھوکر تو ہوا میں اچھلتی ہوئی وہ جا گری اور
ساتھ ہی ایک کاغذ نکل کر اڑا۔ بوچھیے وہ کاغذ کیا تھا؟ وہی گم شدہ وصیت نامہ!"

ہمارا رفیق سفر تھوڑی دیر گاڑی سے باہر میدان میں گھورتا رہا اور پھر آہستہ بولا "واقعہ یہ
ہے کہ وہ کتاب میں نے کھولی ہی نہ تھی، ورق تک نہ کاٹے تھے" جب ٹٹول کر ایک کاغذ نکالا۔" یہ
بے کٹے ورق کی تہ میں پڑا تھا۔ سچ پوچھیے تو ماموں جان کا بھی قصور نہ تھا اُن کو یقین تھا کہ میں
گھر پہنچتے ہی کتاب کو پڑھنے بیٹھ جاؤں گا اور یہی ان سے کہہ بھی دیا تھا"۔ پھر وہ میدان میں نظر
گاڑے ہوئے بولا۔ "اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ایک دوسرے کو سمجھنے میں غلطی کر سکتا ہے۔ خود فریبی میں
وہ بھی مبتلا تھے اور میں بھی — (ماخوذ، مقلوب، ہضموم، حق اخذ و قلب و ہضم محفوظ)
(ستمبر ۱۹۳۹ء)

نور محمد انجم مانپوری گیاوی

پیدائش ۱۳۰۰ھ

جی' آپ سے یقیناً آشنا ہیں، کچہری اور ہوسٹل، پاگل خانہ اور محفل، شادیات اور ہوٹل، الغرض ہر عام و خاص خانہ میں آپ کو دولپیہ ٹوپی، دراز شروانی، تنگ مہری دار پاجامہ میں ملبوس، دبلا پتلا مسکین و ملیح صورت ادیب ضرور نظر آیا ہوگا۔ اوپر کو مڑی ہوئی پتلی سی ٹھڈی پر۔ داڑھی نہ ہوگی، صرف باقیات جیسے شمالی بہار میں ادہر کی کٹی والا پڑتی کھیت۔ بالائی لبوں کی چاہ سے ادھر ادھر دونوں جانب نگاہ دوڑایئے۔ سطح ویسی ہی کھردری ہوگی، اور کناروں پہنچتے ہی اچانک حنا آلودہ موچھیں نظر آئیں گی، گویا بھٹے کی نرم لٹکتی ہوئی بالیں۔ یہ ہیں مانپوری۔

جن کا اصلی نام نور محمد انجم گیاوی ہے۔ پہچانتے ہی آپ ہنس پڑیں گے۔ چراغ دور ہی رکھیں تو بہتر ہوگا۔ کیا معلوم قہقہوں کا ریلا روشنی ہی ختم کر ڈالے۔

مانپوری سے جب میں پہلے پہل ملا تو مل کر مجھے ملال ہوا، پھر مسرت اور پھر حسرت۔ شہر میں مانپوری کا ٹھکانا شاید ہر کوئی نہ بتا سکے۔ ہاں، انجم کو سب جانتے ہیں۔ نادر گنج میں ندی کے کنارے مانپوری کی یچاول کی بڑی

بھاری مل ہے۔ گیا کی اس مشہور مل کی بلند چمنی کا دھواں، دور ہی سے دکھائی دیتا ہے۔ اور نزدیک آتے ہی اس کی کندہ عبارت ANJUM RICE MILL صاف نظر آتی ہے۔ قوی ہیکل آہنی آلات سے مرصع۔ اسی بھرپور میں داخل ہوتے ہی میں نے ایک صاحب سے دریافت کیا "انجم صاحب یہاں تشریف رکھتے ہیں؟" جواب ملا "جی نہیں" پوچھا "کہاں ہوں گے؟" بتایا گیا "یہاں نہیں رہتے" قدرے متوحش عرض کیا "لیکن یہ مل تو..." "جی نہیں انجم صاحب کی نہیں ہے" میں واپس ہو گیا۔ ایک بھلے مانس کو ترس آگیا اور میں اس کے ساتھ ہو لیا — پتا چلا کہ مل انجم ہی کی تھی۔ انہوں نے خود قائم کی، چلایا، فروغ دیا اور جب مل کا عروج ہوا مالک کا زوال؛ پھر مالک مل سے محروم ہو گیا۔

ہم انجم کے مل کے پاس ہی چھوٹے سے مکان میں داخل ہوئے ہیں متصل، ایک بوسیدہ سے گھر میں۔ بالاخانہ پر چڑھے، میں رک گیا، آگے بڑھ کر دروازہ سے لگ کر اس نے پوچھا "مانپوری صاحب ہیں؟" جواب نہ ملا، اس نے پھر پکارا۔ بچہ جیسی ایک نیم واضح آواز سماعت میں آئی، ہم اندر آگئے۔ تقریباً ایک کمرے میں تنہا ایک شخص لیٹا تھا، فالج زدہ اور رعشہ میں گرفتار!! اس کا سارا جسم اور ہر عضو لرز رہا تھا؛ کپکپاتا ہوا ہوا پلنگ کا بستر ساکت کمرے میں مدھم تھپیڑے لگا رہا تھا، متواتر اور مسلسل۔ بدن کا لرزہ اس کے خدوخال کو دھندلا رہا تھا اور شدت ارتعاش سے اس کا چہرہ پہچاننا نگاہوں کے بس سے دور تھا۔ دیکھتے ہی میرے ہوش اڑ گئے صامت ہو گئے!

جاڑے کی تند بر فانی شب بھی جسم میں انتا رعشہ پیدا کرنے سے مجبور ہوگی!

مریض کے کانپتے ہوئے ہاتھ ایک طرف کو اٹھے، مگر ارتعاش کوئی اشارہ نہ بتا سکا۔ مرتعش زبان ہکلاتی ہوئی بولی لیکن الف و ع کی ہم آہنگی سے زیادہ معنی پیدا نہ ہو سکا۔ ہم نیچے اتر آئے۔ بستر سے لگا ہوا چلنے پھرنے، بولنے کھانے سے مایوس، یہ زندہ اور نوجوان مریض انجم کا اکلوتا داماد ہے۔ جو شادی کے چند ماہ بعد ہی مہلک ترین فالج کا شکار ہو گیا ------ ! جی اداس ہو گیا، جیسے اشتیاق و امنگ پر اوس پڑ گئی ہو، لیکن ماتھوری سے باتیں کرکے یہ المناکی گھل سی گئی۔ پہچانتے ہی بہت محظوظ ہوئے، پر یہ نہ کہا "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی"۔ پاس ہی کھری چارپائی بچھی تھی، خود بلا تکلف بیٹھ گئے، اور میں بھی بلا تکلف تشریف فرما ہوا۔ چائے منگوائی، پھر باتیں کرنے لگے، نہ ہنستے ہوئے اور ہنساتے ہوئے۔ شاعری پر افسانہ نگاری پر، ترقی پسندی پر، عوام کے مذاق پر اور ملک کی تقدیر پر۔ میں نے محسوس کیا، شگفتہ ظرافت سارا اوس اور ساری نمناکی جذب کر چکے تھے۔ گھنٹہ بھر ٹھہرا، بولنے کا موقع کم ملا اور سننے کا زیادہ۔ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ ذاتی باتیں آئیں، تو اس طرف نگاہ ہی نہ اٹھائی۔ جیسے ؎

غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

۔۔ ملال اور مسرت کے بعد دل پر اب حسرت کا بار بھی صاف محسوس کر رہا تھا۔

ہمارے ہاتھوں میں انگلیاں ہوتی ہیں اور انگلیوں میں ناخن، کسی میں بڑا،

کسی میں نوکیلا، کسی میں گول اور کسی میں ٹھٹھرا! دونوں بند مٹھیوں کو دفعتاً آپ فضا میں چھتر ادیں تو اشارہ دس پڑتا ہے ـــ

ناکارہ حسن نظامی رشید احمد کنہیالال رموزی

چغتائی عظمت اللہ پطرس فرحت اللہ شوکت

ہماری اوسط انگلیوں کی طرح ہمارے انشائیہ نگاروں کی یہ تعداد بھی اوسط ہی ہے، لیکن قدرت کسی دستِ خاص کو ایک انگلی مزید عطا کر دیتی ہے، اور مانپوری سمیت اب یہ اوسط تعداد دس سے گیارہ ہو جائے گی، اوسط اب استثنا ہے اور چھ انگلی والے اس دستِ خاص کو ہم خالق کا کرشمہ کہتے ہیں۔ مانپوری بغیر عروسِ ادب اُردو کا یہ دستِ انشائی عام رہے گا، اوسط کہلائے گا، لیکن کرشمہ نہ ہو سکے گا ـــــــ پر ایک بات، چھ انگلیا سنتے ہی شاید آپ کا ذہن ہر انشائیہ نگار کا مقام بھی مقرر کرنے لگے، یہ بات عبث ہو گی، ان تمام انگلیوں میں چھ انگلیا کے علاوہ شہادت کی انگلی اور چھنگا کا بھی تو اپنا مرتبہ ہے، جسے چاہیئے جدھر بٹھایئے۔ اب یہ آپ کے مذاق پر منحصر ہے۔

جی ہاں، تو انگلی کے ساتھ ہی ان میں ناخن بھی ہوتے ہیں۔ رشید احمد کے ناخن بہت بڑھے ہیں، تیز اور نوکیلے، جیسے ہفتوں کیا، مہینوں یہ کترنی سے موصول نہ ہوئے ہوں ـــ مضامین رشید میں انشائیہ نگاری کی تصویر خود بھی یہی کہتی ہے ـــ ابھی میرے ناخن ہی کیا، میرے بال، میرا چہرہ، میری شیروانی، میرا کالر اور خود میں کب باوضع ہوں؟ ـــــ

رشید احمد کے انشائیے واقعی چبھتے ہوئے سے ہیں اور یہ چبھن بعض دفعہ تو اس قدر خیرناک ہوتی ہے، جیسے انگلی بڑے پیار اور سنجیدگی سے ہلکے ہلکے خواب آور لمس دے رہی ہو کہ دفعتاً یہ کیف اذیت میں بدل جائے، تیز، نوکیلے ناخن سے خون کی بوندیں ہی نکل آتی ہیں۔ ! پطرس کی انگلی دیکھ کر مصوّر رسالوں کی CUTEX والی تصویر یاد پڑتی ہے؛ جیسے مخروطی انگلی پر نیم گلابی چمکتا ہوا ناخن، جیسے بط کے انڈے کا اوپری سرا۔ پطرس کے مضامین پڑھ کر سچ مچ ہی لطف ملتا ہے، ترنگ افزا اور رکیک خیر ناکارہ، چغتائی، عظمت اللہ وغیرہ خوب ہنساتی ہیں، جیسے ہنسیئے، کیسے نہ ہنسیئے گا نہیں تو میں پیٹ میں گدگدی لگاتی ہوں، اور ان انگلیوں کے ناخن واقعی گول ہیں؛ صرف گدگدی لگانے کے لائق ٹھٹھرے سے ہیں یہ ناخن۔ کنہیا لال اور فرحت اللہ ہنساتی ہیں اور کبھی کبھی جاتی ہیں کہ کتنی دلچسپ ہے دنیا اور کس قدر سبق آموز۔ شوکت اور رموزی کی انگلیوں کے ناخن بڑے ہیں اور نوکیلے لیکن ان میں میل جمع ہوتا ہے، ناخن گڑتا ہے، چبھن ہوتی ہے، اور ساتھ ہی میل داخل ہو جاتا ہے جس سے سیپٹک ہو جانا لازمی ہے۔ مانپوری کی انگلی .... لیکن آپ کہیں گے کہ چراغ دکھاتے دکھاتے میں آپ کو یہ انگلیاں کیا دکھانے لگا؟ بے ادبی معاف ! مانپوری بھی ایک اچھے اور مقبول انشائیہ نگار ہیں۔ اردو انشائیوں کا ذخیرہ ویسے ہی خودرو گھاس کی طرح پامال اور عدم توجہ کا شکار ہو رہا ہے اور ہمارے مخصوص و کامیاب انشائیہ نگار کی تعداد تو محض ہاتھوں کی انگلی ہی اتنی ہے۔ مانپوری کی تحریر کو اگر آپ مضمون سے موسوم کریں گے تو

میں آپ کی سمجھ کی داد دوں گا۔ اسے افسانہ قرار دیں گی تو یہ آپ کے معیار کا ثبوت ہوگا اور اگر آپ اسے کسی نام سے تخصیص نہ کریں گے تو ادب اردو پر آپ کا کرم ہوگا۔ ہاتھ کھولنے انگلیاں تبانے اور ناخن دکھانے کا مقصد اردو کی اس صنف نو اور لطیف کا محض ڈیمانسٹریشن تھا، خدا کرے آپ خوش ہو جائیں!

انشائیہ کی اصطلاحی تعریف اردو میں قدرے دشوار ہے۔ مغرب میں یہ فن پارہ نیا نہیں۔ اٹھارہ صدی عیسوی کے آغاز ہی میں انگریزی جریدے TATLER اور SPECTATOR میں معاصر ادبا کے اچھے انشائیے موجود ملتے ہیں جو عوام میں بہت مقبول تھے۔ انگریزی تعریفوں میں مجھے جانسن کی تعریف بہت پسند ہے، وہ کہتا ہے

"IT IS A LOOSE SALLY OF MIND" .... یعنی درحقیقت انشائیہ دماغ کی ایک ترنگ ہے۔ آزاد اور خوشگوار کامیاب انشائیوں میں، ہمیں گپ نظر آتی ہے، کسی موضوع پر فن کار کی اپنی گپ، جس میں سنجیدگی اور تفریح کا میل ہوتا ہے۔ موضوعات پر پابندی نہیں، کیوں کہ :۔

"HE CAN CATCH HOLD OF ANY THING AND CAN MAKE SOME-THING OUT OF NOTHING"

اسی "کچھ" میں مزاح، پھبتی، طنز، ہجو، خاکہ، قصہ، سبھی کا لطف ملتا ہے۔

مانپوری کے انشائیے اُردو کے چند معیاری انشائیوں پر پورے اُترتے ہیں۔ ان میں نفیس مزاح اور ہلکے طنز کا امتزاج ہوتا ہے ۔۔ مانپوری اس وقت بالکل ناکامیاب نظر آتے ہیں جب ان کے انشائیوں میں کہانیئت یا قصہ گوئی کا عنصر تیز ہوجاتا ہے ۔ انشائیہ میں دراصل پلاٹ کا استعمال اس کی روح کو فنا کردیتا ہے اور افسانویت اس کی ناکامیابی کا باعث ہوجاتی ہے ۔ "طنزیات مانپوری" ان کے کئی انشائیوں کا مجموعہ ہے ، جس کی دو جلدیں شائع ہوچکی ہیں اور جس کی دوبارہ اشاعت بھی ہوچکی ہے ۔ مطائبات مانپوری میں تازہ ترین انشائیے ہیں ۔

انڈر گریجویٹ

یوں ہٹ دھرمی کی اور بات ہے ورنہ انگریزی تعلیم کے فیوض و برکات سے کون بھلا مانس انکار کر سکتا ہے۔ نصف صدی کے اندر ہی وضع قطع، خیالات معاشرت میں یورپ کے قریب قریب پہنچ جانا خرقِ عادت نہیں تو کیا ہے۔ اور باتوں کو چھوڑیئے، موجودہ نصابِ تعلیم کا یہی احسان کیا کم ہے کہ لاکھوں نوجوانوں کو تعلیمی ڈگریاں دلوا کر اس لائق بنا دیا کہ زراعت، تجارت، صنعت حرفت جیسے ذلیل کاموں کی طرف سے توجہ ہٹا کر سرکاری ملازمت کی عزت حاصل کرنے کے لیے نہایت ہی آزادی کے ساتھ قسمت آزمائی کریں۔ اب اگر اپنی کوشش میں کسی کو کامیابی نہ ہو تو اس میں انگریزی تعلیم کا کیا قصور۔ یونیورسٹی کا کام تو سر مونڈ کر چیلا بنا لینا ہے، مانگ کھانے کا کام تو آپ کے ذمہ ہے۔

اس کے بعد مانگ کھانے کی سند پاس رہنے کے باوجود در در ٹھوکریں کھانے پر
بھی روزی کا سہارا نہیں ملتا تو یونیورسٹی پر کیا الزام بعض سر پھرے انگریزی دانوں
کی بے روزگاری کا سارا الزام گورنمنٹ کے سر تھوپ دیتے ہیں، حالانکہ
گورنمنٹ نے انہیں انگریزی تعلیم یافتوں کو کھپانے کے لیے آج کل ملازمت
کا حلقہ اتنا وسیع کر دیا ہے جس میں کافی گنجائش ہے۔ پہلے بی۔اے۔ ایم۔اے
کو ڈپٹیائی قسم کی صرف وہی اونچی نوکریاں ملتی تھیں، جن کو رات دن دماغ
سوزی کے باوجود ہر وقت باز پرس کا خوف لگا رہتا تھا، اب ازراہ علم پروری
ان گراجوئٹس کو جن کی طبیعت تجارت و زراعت جیسے پست قسم کے کاموں
کی طرف مائل نہیں ہوتی، آسان سے آسان ملازمت اور قسم اوّل اردلی
وچپراسی کی جگہ تک دینے میں گورنمنٹ عذر نہیں کرتی، کیونکہ ملازمت اور وہ
بھی سرکاری چاہے اردلی کیوں نہ ہو، کاروباری ذق ذق بق بق کے کاموں
سے تو بہر حال بہتر ہے۔ ایک عالی خیال اور روشن دماغ گراجویٹ سے
بنیوں کی تجارت کا کام لینا یونیورسٹی کی ڈگری کی توہین نہیں تو اور کیا، کہ
منہ ٹاکس میں اور مس کو دوکان کا کوڑی کوڑی حساب رکھنے کے لئے کہنا
ایک گراجویٹ کی کس قدر انسلٹ ہے۔ اکونمی میں جو فرسٹ ہوا ہو اس سے
تجارتی کفایت شعاری کی امید رکھنی اعلیٰ تعلیم کا کس قدر بیجا مصرف ہے۔
ملازمت میں اور نہیں تو اک یہی فائدہ کیا کم ہے کہ آدمی کو اپنی وضع اور فیشن کی
نگہداشت کا کافی موقع ملتا رہتا ہے، کیونکہ ننانوے کے پھیر میں پڑنے کے بعد
تو پھر نہ کالر کی پروا نہ ٹائی کی فکر، نہ فیشن کا خیال۔ رات دن صرف روپیہ

کرنے کی دھن۔ حالانکہ ایک تعلیم یافتہ جنٹلمین کی یہ پہچان اس کا اپٹوڈیٹ فیشن ہے، اور جب اسی کے رکھ رکھاؤ کا موقع نہیں ملے تو پھر ایک عام آدمی اور تعلیم یافتہ میں فرق ہی کیا رہ جاتا ہے۔

میرے ملاقاتیوں میں ایک گراجویٹ صاحب ہیں۔ ان کے کان میں خدا جانے کس نے کیا پھونک دیا کہ اپنی نوکری کی کوشش اور سفارش کے سلسلہ میں بڑے بڑے لوگوں سے صبح و شام جو مفت ملنے کا موقع ملتا تھا اس اعزاز کو چھوڑ چھاڑ باکی پور ڈاک بنگلہ روڈ میں چند موچیوں کو ملازم رکھ کر جوتے کی ایک دوکان کھول دی۔ یہ کون نہیں جانتا کہ موچی کیا، بلکہ دھوبی کا کام بھی آدمی شروع کرے تو سو پچاس روپیہ ماہانہ لے ہی مرے گا، مگر پوزیشن بھی آخر کوئی چیز ہے۔ ایک شریف ہندوستانی اور وہ بھی تعلیم یافتہ اور تعلیم بھی معمولی نہیں، فرسٹ کلاس کا گراجویٹ اور وہ کرے موچی کا کام یہ قرب قیامت کی نشانی نہیں تو اور کیا ہے۔ اس گراجویٹ موچی کو دیکھ کر مجھے بڑا ترس آیا کہ ایک ہائی کلاس کا ایجوکیٹڈ آدمی ایسے نیچے درجے کے کام میں اس قدر پھنس گیا کہ کالر میں چمک دار پولش، نہ ٹائی کا نوٹ باقاعدہ بندھا ہوا، کوٹ کی آستین کا ایک بٹن غائب، پتلون میں شکنیں پڑی ہوئی، جوتے کی دوکان کے باوجود بوٹ پر وارنش تک نہیں۔

روپیہ کمانے کے استغراق میں فیشن تک کا خیال نہیں اور سب سے بڑھ کر داشت اور شان خودداری جو ہر گراجویٹ کی امتیازی خصوصیات ہیں، ایک دم مفقود۔ بلا خیال اس کے کہ کوئی کیا کہے گا۔ اپنے موچیوں سے بے تکلفانہ باتیں کر رہے

ہیں۔ انگریزی تعلیم کی اس بے قدری کو دیکھ کر جی چاہا کہ پاس پہنچ کر صاف صاف
کہہ دوں کہ اگر بیچارہ یہی کا کام کرنا تھا تو گریجویٹ ہونے کی ضرورت ہی کیا تھی،
مگر کس کے سامنے جا کر سر کھپاتا، وہاں تو خدا جانے کس نے دماغ میں ٹھونس دیا
تھا کہ آزادی کے ساتھ اپنی قوتِ بازو سے چار پیسے کمانے والا، اُن اونچی
تنخواہ پانے والے عہدہ داروں سے کہیں زیادہ باعزت ہے جن کی غلامانہ
زندگی دوسروں کی خوشنودی پر موقوف ہے۔ اب انہیں کون سمجھائے کہ ایسے
چھوٹے کام سے جس میں ہر ایرے غیرے آنے والے گاہکوں کی خوشامدیں کرنی
پڑیں سرکاری نوکری چاہے چپراسی گیری ہی کیوں نہ ہو، بہرحال بہتر ہے۔ کیونکہ
اس میں سخت کلامی یا ڈانٹ ڈپٹ کبھی سننے کی نوبت بھی آتی ہے تو بڑے
بڑے افسروں کی اور وہ بھی آفس ہی کے اندر، باہر کسی کو خبر تک نہیں
ہوتی۔ بزنس والوں کی طرح، ہر معمولی خریدار سے چاپلوسی کی باتیں تو نہیں
کرنی پڑتیں۔

اب اگر آپ ڈیسن یا آج کل کے باٹا کمپنی کی مثال دے کر کہیں کہ
آخر انگریز بھی تو اس طرح کے کام کرتے ہیں تو جناب انگریزوں کی بات ہی اور
ہے۔ ترقی یافتہ قوم کے لئے سب جائز ہے تو ہندوستانی اگر تقلید کرنی چاہتے
ہیں تو وضع، فیشن، معاشرت وغیرہ میں تو چنداں مضائقہ نہیں لیکن
کاروبار میں ان کی برابری کرنی گویا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ خیریت یہی ہے
کہ ملازمت کا خیال چھوڑ کر کاروباری محنت مشقت کا خبط ابھی چند ہی
تعلیم یافتوں کے دماغ میں سمایا ہے جنہیں گریجویٹ ہو جانے کے باوجود

معمولی سے معمولی کام کرنے میں عار نہیں، بقیہ کل عالی دماغ اور روشن خیال گریجویٹس خدا کے فضل سے پختگی کے ساتھ ابھی تک اسی عزم پر ڈٹے ہوئے ہیں کہ دس پندرہ ہی کی جگہ کیوں نہ ہو مگر کریں گے تو سرکاری نوکری۔ ذلیل کمینوں کا کام زراعت اور خسیس نیچوں کا پیشہ تجارت وغیرہ کرکے انگریزی تعلیم کو رسوا نہ کریں گے اور سچ پوچھیے تو ایسے ہی اولوالعزم گریجویٹس کے دم سے ابھی تک انگریزی تعلیم کا وقار قائم ہے۔

مذکورہ بالا حالات تو گریجویٹس کے ہیں جنہیں ہر شخص جانتا ہے اس پر مزید روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں، اصل جاننے اور اس سے واقفیت حاصل کرنے کی چیز انڈر گریجویٹس کے حالات ہیں۔ انگریزی تعلیم کے فیوض و برکات دیکھنا چاہیں تو گریجویٹ نہیں، انڈر گریجویٹ کو اسٹڈی کریں۔ یہ اس لیے کہ گریجویٹس کی زیادہ تعداد تعلیمی فضا سے جدا ہو جانے کے بعد مختلف ماحول سے اثر پذیر ہو کر ان خصوصیات کو کھو بیٹھتی ہے جو انگریزی تعلیم کے لازمی نتائج ہیں، البتہ انڈر گریجویٹس کے حالات جن کی دماغی نشوونما کالج کی آب و ہوا میں ابھی ہو رہی ہے۔ اور دلچسپی سے خالی نہیں۔

انڈر گریجویٹ کی صورت شکل، چال، ڈھال، بات چیت وضع قطع عام انسانوں سے بالکل جدا آپ پائیں گے۔ آپ کو انڈر گریجویٹ کے پہچاننے کے لیے کسی سے دریافت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کی ہیئت کذائی ہی دیکھ کر آپ کہہ دیں گے کہ یہ یقینی انڈر گریجویٹ ہے جس طرح مغربی خواتین نسوانی سوٹ بوٹ پہن کر اندر جوڑا کٹوا کر مرد بننے کے لئے ایڑی چوٹی

کا زور لگا رہی ہیں اسی طرح ان کے مقابلہ میں ہندوستانی انڈر گریجویٹ بھی سر کے آگے والے لانبے لانبے ایال نما بال میں کنگھی سے مانگ نکال کر اور کنگن کی جگہ رسٹ واچ کی سنہری زنجیر نازک کلائی میں باندھ داڑھی مونچھ کا صفایا کرکے مردانہ صورت کا امتیاز مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس ہیولی میں جس نوجوان کو آپ دیکھیں بس سمجھ جائیں کہ انڈر گریجویٹ ہے۔ چال میں تفاخر، بات میں تمسخر، برتاؤ میں تنفر انڈر گریجویٹ کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ گفتگو کرتے وقت اگر آپ دیکھیں کہ ایک ہاتھ تو پتلون کی جیب میں ہے اور دوسرا کالر اور ٹائی کی درستگی میں مصروف، اور باتیں تو کر رہے ہیں آپ سے اور نگاہیں دوسری طرف، پھر اس کے پوچھنے کی ضرورت نہیں کہ آپ انڈر گریجویٹ ہیں یا کوئی انسان۔ اگر آپ اپنے مخاطب سے سن میں زیادہ ہوں اور بدقسمتی سے آپ انگریزی نہ جانتے ہوں تو تحقیر اور تمسخر کا پہلو لیے ہوئے چبا چبا کر اس طرح باتیں کی جائیں گی کہ آپ کو پھر اس کے انڈر گریجویٹ ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہے گا، صرف داڑھی مونچھ کی صفائی ہی اور زنانہ بناؤ سنگار ہی انڈر گریجویٹ کا ٹریڈ مارک نہیں، بلکہ کٹ، شیپ اور ڈیزائن سے بھی آپ کو پتہ لگ جائے گا کہ یہ میڈ ان کالج ہے۔ جس جلسہ میں آپ ہڑبونگ دیکھیے کہ یہاں انڈر گریجویٹس کی تعداد زیادہ ہے، اور خاص کر کسی علمی جلسہ یا بزم ادب میں جب آپ تقریر یا نظم پڑھنے کے درمیان طرح طرح کی پھبتیاں سنیں تو یقین کر لیں کہ یہ قدردانیاں انڈر گریجویٹس کی طرف سے ہو رہی ہیں۔ آپ اگر چاہیں تو بغیر صورت دیکھے بھی رائے قائم کر سکتے ہیں کہ یہ انڈر گریجویٹ

ہے مثلاً آپ کی نظر سے کوئی ایسا خط گذرے جس کے خوشنما لفافہ پر پتہ تو خوشخط
انگریزی میں لکھا ہو اور اندر خط کا مضمون اُردو میں ہو، مگر نہ اس کی عبارت درست
نہ املا صحیح تو بلا تامل آپ کہہ دیں کہ اس کا لکھنے والا کوئی انڈر گراجوئیٹ ہے۔ کسی
شاندار کوٹھی یا کسی معمولی مکان میں آپ کو جانے کا اتفاق ہو اور اس کے
کسی چھوٹے سے کمرہ یا کوٹھری میں آپ دیکھیں کہ اس کی دیواروں کی زینت
عریاں تصاویر ہیں۔ ایک طرف طاق میں آئینہ، کنگھی، سیفٹی ریزر قرینہ سے
رکھے ہوئے ہیں اور دوسری طرف میز پر ناولوں اور فلمی رسالوں کے ساتھ
ساتھ ایکٹرسوں کی تصاویر کا البم بھی ہے، ایک جانب کونے میں ٹارچ ہے
دوسری جانب چوکی کے کسی گوشہ میں تاش اور شطرنج کی بساط اور مہرے منتشر
ہیں تو آپ کو اس نتیجہ پر پہنچنا پڑے گا کہ یقینی کسی انڈر گراجوئیٹ کا دارالمطالعہ
ہے۔ یہ تو انڈر گریجوئیٹ کی وضع اور اس کی معاشرت سے آپ کو پتہ
لگ جائے گا لیکن اس سے بڑھ کر عجیب بات یہ ہے کہ اس کے اعزہ و اقربا
کے طرز کلام سے بھی آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس خاندان میں کوئی انڈر گراجوئیٹ
ہے اور اس کا پتہ عموماً اس وقت زیادہ لگتا ہے جب اُن لوگوں سے کوئی
رشتہ ناطہ کی گفتگو کا موقع ملے۔

اگر کوئی صاحب رشتہ کی بات چیت کے پہلے کھانا، جوڑا، جہیز
سلامی کی رقم کے ساتھ ساتھ تلک فنڈ کی مقدار دریافت کریں تو سمجھ جائیے
کہ ان کا نور نظر سلمہ یقینی انڈر گراجوئیٹ ہے، کیونکہ اس طرح بیجا فرمائشیں
کرنے کی ہمت آدمی کر نہیں سکتا، جب تک کہ اس کا فرزند ارجمند طول عمرہٗ

انڈر گریجویٹ نہ ہو، اور سچ پوچھئے تو یہ مطالبے اپنی جگہ پر حق بجانب بھی ہیں، اس لیے کہ اگر خدانخواستہ صاحبزادہ سلمہ انڈر گریجوئٹ سے کہیں گریجویٹ ہوگئے تو سرکاری نوکریوں کا حال معلوم ہی ہے، اب ایک تعلیم یافتہ جنٹلمین کے اخراجات کے لیے یونیورسٹی کی ڈگری کے بعد گھر کو قرقی سے بچانے کی، سوائے اس کے اور کیا صورت ہے کہ شادی ہی کو ذریعہ معاش بنایا جائے اور اگر خدانخواستہ نکاح پہلے ہو چکا ہو اور لڑکی کی بدقسمتی سے اس کے بعد انڈر گریجویٹ ہو گئے تو آپ کیا سمجھتے ہیں کہ عقد کی زنجیر میں بندھ جانے کے بعد ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع ہی نہیں رہا؟ جی آپ ہیں کس خیال میں سسرال والوں سے کافی رقمیں وصول کرنے کا موقع تو نکاح کے بعد ہی ملتا ہے، کیونکہ برات کے رسوم ادا کیے بغیر تو شادی ہی نامکمل۔

اب لڑکی والوں کی طرف سے شادی کے لیے تقاضا پر تقاضا ہے۔

آدمی پر آدمی جا رہے ہیں، خط پر خط لکھے جا رہے ہیں، مگر ؏

واں ایک خاموشی تری سب کے جواب میں

اگر کسی لڑکے والے نے انسانیت برتی تو یہ جواب لکھا کہ جب تک لڑکا اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لائق نہ ہو اس وقت تک خانہ داری کا بوجھ ڈالنا کسی طرح مناسب نہیں۔ لیجیئے صاحب اب اس سے لولے لنگڑے لڑکے کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے لیے سسرال سے نقدی سہارا جب تک نہ ملے سسرال کی طرف قدم بڑھا کیسے سکتا ہے۔ مجبوراً "پھنسا بنیا سودا کرے" کی حیثیت سے زیادہ مطالبے پورے کرنے ضروری ہیں، یہ کیوں اس لیے کہ

لڑکا انڈر گریجویٹ ہے جن بدنصیبوں کو ایسے لوگوں سے واسطہ پڑا ہے
وہی کہہ سکتے ہیں کہ انڈر گریجویٹس دوسروں کے لیے کس قدر مصیبت
بن جاتے ہیں۔

میرے ملاقاتیوں میں ایک صاحب ہیں جن کا نام تو حبیب اللہ
ہے مگر جو مختار کے نام سے زیادہ مشہور ہیں۔ انھوں نے اپنے فرزند ارجمند
میاں رضا علی عرف رجو کی نسبت ایک قریبی رشتہ دار مولوی فرحت اللہ
کی لڑکی سے اسی وقت ٹھہرائی تھی، جس وقت صاحبزادہ سلمہ نے میٹرک
بھی پاس نہیں کیا تھا، کئی سال کے بعد خوش نصیبی یا بدقسمتی سے علی گڑھ
میں آئی اے کا امتحان پاس کر کے جو میاں رجو انڈر گریجویٹ ہو گئے تو مختار صاحب
نے پرانے رشتہ کا خیال چھوڑ کر بڑے بڑے دولت مند گھرانوں میں پیام
پیامی شروع کر دی۔ مولوی فرحت اللہ کی طرف سے جب شادی کا تقاضا
شروع ہوا تو پہلے کچھ دنوں ٹالتے رہے اور تاریخ مقرر کرنے پر جب زیادہ
اصرار کیا گیا تو یہ کہہ کر صاف جواب دے دیا کہ یہ رشتہ عزیزی رجو سلمہ کو پسند
نہیں اس لئے مجبوری ہے۔ بلا وجہ رشتہ منقطع کرنے پر جب بعض عزیزو
نے ملامت کی تو مختار صاحب بگڑ کر کہنے لگے "تو کیا جان بوجھ کر اپنے ہونہار
انڈر گریجویٹ لڑکے کو ایسی جگہ جھونک دوں کہ آئندہ چل کر جب ایک دن
ڈپٹی مجسٹریٹی کی جگہ ملے گی تو وہاں اس کے پوزیشن کے لائق رہنے کے لئے نہ
کوئی شاندار کوٹھی، نہ فرنیچر نہ موٹر، نہ اور کوئی دوسرا سامان، آخر سسرال
میں رہنے کی صورت کیا ہوگی۔" اس کے جواب میں کہا گیا کہ مولوی فرحت اللہ

بہت بڑے زمیندار نہ سہی لیکن پانچ چھ ہزار سالانہ آمدنی کی جائداد دال روٹی سے خوش رہنے کے لیے کافی ہے۔ یہ سن کر مختار صاحب نے فرمایا "میں سمجھ کر تو میں نے یہ رشتہ پہلے کیا تھا لیکن جس وقت نسبت ٹھہری تھی اس وقت فرحت جہاں کی صرف یہی ایک لڑکی تھی۔ اس کے بعد چند ہی برسوں میں تلے اوپر آدھے درجن کے قریب لڑکوں اور لڑکیوں کی تعداد پہنچ گئی۔ اب ترکہ میں میرے رجو سلمہ کے حصّہ کی جائداد ہی کیا رہ جاتی ہے"۔

مختصر یہ کہ مولوی فرحت کو صاف لفظوں میں کہلا بھیجا کہ اپنی لڑکی کا کوئی دوسرا رشتہ تلاش کریں اور خود خاص خاص لوگوں کے ذریعہ اپنے صاحبزادہ کے رشتہ کا ایڈورٹائزمنٹ شروع کر دیا۔ مختلف جگہوں سے پیام پیامی بھی ہونے لگی، لیکن جس سے رشتہ کی بات چیت ہوتی، مختار صاحب سب سے پہلے حسب ذیل سوالات ضرور کرتے، کھانے جوڑے کی رقم پہلے معلوم ہونی چاہیئے۔ جہیز میں کیا کیا چیزیں ملیں گی، موٹر بھی اس فہرست میں ہے یا نہیں، نقدی سلامی کس قدر ملنے کی اُمید ہے؟ لڑکے کے تعلیمی اخراجات کے کفیل ہوں گے یا نہیں؟ اگر لڑکا بغرض تعلیم ولایت جانا چاہے تو اس کے اخراجات بھی برداشت کرنے کو تیار ہیں یا نہیں؟ ان فرمائشوں کے علاوہ سب سے زیادہ اور اہم سوال یہ ہوتا کہ ترکہ میں ملنے والی جائداد کی آمدنی کی مقدار کیا ہے۔ اس اُمید پر کہ جس کا اوفر زیادہ ہوگا اسی کا کانٹریکٹ کیا جائے گا۔ ابھی تک مختار صاحب نے کہیں رشتہ کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کیا تھا۔ اتفاق سے ایک روز مولوی عبدالقیوم وکیل کے یہاں مختار صاحب کسی مقدمہ میں مشورہ کے لیے پہنچے۔

قانونی مشورہ کے بعد رشتہ کا ذکر جو انہوں نے چھیڑا تو وکیل صاحب نے کہا "ہاں خوب یاد دلایا۔ میرے عم زاد بھائی پروفیسر رضوی ایم۔ اے کو جو آج کل حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں سائنس کے لکچرار ہیں آپ یقینی جانتے ہوں گے ان کا اصلی مکان میری بستی سے دو میل کے فاصلہ پر موضع حسن پور ہے، مگر ایک عرصہ سے حیدرآباد ہی میں مستقل سکونت اختیار کرلی ہے۔ ان کی ننہیال آپ ہی کی بستی میں ہے۔ اس لئے ممکن ہے کہ آپ سے بھی کوئی جہت ہو" مختار صاحب نے کہا "ہو سکتا ہے مگر آخر آپ کے کہنے کا مطلب کیا ہے" مولوی عبدالقیوم نے کہا کہ کل ایک خط بھائی رضوی کا میرے پاس آیا ہے کہ میں اپنی بچی کا رشتہ اسی طرف اپنے ہی لوگوں میں کرنا چاہتا ہوں۔ کسی مناسب رشتہ کی تلاش کے لئے مجھے لکھا ہے، آپ اپنے صاحبزادہ کی نسبت اگر پہلے ہی دوسری جگہ پختہ نہ کئے ہوتے تو یہ نہایت ہی اچھا موقع تھا مگر خیر جو بات ہونی تھی وہ ہو چکی۔ اب آپ سے کہنے کی غرض یہ ہے کہ آپ وابستہ اپنی برادری میں کوئی لائق لڑکا ہو تو مجھے خبر دیجئے گا مگر لڑکا ہو تعلیم یافتہ دولت مند ہونے کی قید نہیں۔ کیونکہ خدا کے فضل سے انہیں خود کسی بات کی کمی نہیں۔ آٹھ سو روپیہ ماہانہ پروفیسری کی اپنی تنخواہ کے علاوہ ان کے والد بزرگوار نے جو حیدرآباد میں ایک معزز عہدے پر سرفراز تھے تقریباً دو ہزار ماہانہ کرایہ کی آمدنی کے مکانات اور ڈیڑھ لاکھ روپیہ بنک میں چھوڑے ہیں اور ان سب کی تنہا وارث آنکھ کان میں پروفیسر رضوی کی یہی اکلوتی بچی ہے خیر آپ کے لئے تو اب موقع رہا نہیں لیکن کسی اچھے گھرانے کا کوئی تعلیمیافتہ لڑکا آپ کے دانستہ ہو تو انہیں خبر دی جائے" پروفیسر رضوی کی دولت اور

آمدنی کا حال سُنکر مختار صاحب کے منھ میں پانی بھر آیا، کہنے لگے "وکیل صاحب
آپ کو شائد خبر نہیں کہ اس رشتہ کو منقطع ہوئے زمانہ گذرا، کئی جگہوں سے پیام
بھی آنے شروع ہو گئے ہیں، لیکن ابھی کہیں بات پختہ نہیں ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے
کہ حیدرآباد ہی میں یہ رشتہ مجھے کرنا پڑے گا۔ اپنے گھر میں لڑکی رہتے ہوئے
دوسری جگہ مجھے تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے آپ انہیں آج ہی لکھ دیجئے
کہ مجھے منظور ہے۔ آپ جیسے لڑکے سے رشتہ کرنے میں انہیں بھی کوئی عذر نہ ہوگا۔

ع در کار خیر حاجت ہیچ استخارہ نیست

بس اسی وقت لکھ بھیجئے کہ میں نے آپ کی طرف سے زبان دیدی"۔ وکیل صاحب
نے کہا "اول تو زبان دینے کا مجھے کوئی اختیار نہیں، دوسرے رشتہ ناطے میں
اتنی جلدی کرنی بھی مناسب نہیں۔ مجھے یوں آپ کی طرف سے پیام بھیجنے میں
کوئی عذر نہیں، لیکن دقت یہ آپڑی ہے کہ رضوی صاحب باوجود ام اے
ہونے کے مولوی ٹائپ کے آدمی اور آپ کے صاحبزادہ ٹھیٹ ایک دم صاحب
بہادر۔ وہ پرانی تہذیب کے گرویدہ اور یہ انگریزی طرز معاشرت کے دلدادہ،
وہاں مذہبیت اور یہاں مغربیت اس لئے یہ اجتماع ضدین کچھ ناممکن سا معلوم
ہوتا ہے"۔ مختار صاحب نے کہا "ذاتی معاملات سے آپ کو کیا غرض۔ دیکھنا
یہ ہے کہ جس سے وہ رشتہ کر رہے ہیں، تعلیم یافتہ ہے یا نہیں، اپنی برادری کا
انڈر گریجویٹ رہتے ہوئے دوسری جگہ منسوب کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم
ہوتی۔ بھائی رضوی کے والد کی پہلی شادی میری ممانی کے حقیقی چچا کے سگے
ماموں کی اپنی بھتیجی سے ہوئی تھی، اس لئے ان سے قریبی تعلق بھی ہے اور پھر

مجھ سے اور آپ سے جو تعلقات ہیں، ان سے مجھے اُمید ہے کہ آپ اگر زور دار لفظوں میں لکھ دیں گے تو یقیناً وہ منظور کرلیں گے"۔ مختصر یہ کہ نہایت ہی اصرار کے ساتھ مختار صاحب نے اپنے سامنے مولوی عبدالقیوم صاحب سے اپنے صاحبزادہ کی نسبت کے متعلق خط لکھوایا۔ گو وکیل صاحب نے بہت احتیاط سے کام لیا، لیکن پھر بھی مختار صاحب کے بتائے ہوئے بعض جملے مروّتاً لکھنا ہی پڑے۔ آٹھویں روز حیدر آباد سے حسب ذیل جواب آیا:-

محترمی وکیل صاحب، سلام و رحمت

میری بچّی کے رشتہ کی تلاش میں جو زحمت آپ نے اُٹھائی اس کا رسمی شکریہ ادا کرنا اس لئے نہیں مناسب سمجھا کہ یہ بھی گویا آپ ہی کی بچّی ہے۔ جس لڑکے کے بارہ میں آپ نے لکھا ہے اگر آپ کی رائے ہے تو مجھے کوئی عذر نہیں، مگر چونکہ ایک عرصہ سے میرا ارادہ ہے کہ دو ماہ کی رخصت لے کر اپنے وطن مالوف کے اعزّہ اور احباب سے ملنے کے لئے وہاں پہنچوں۔ بدقسمتی سے بعض موانع کے باعث اب تک آنے کا موقع نہ نکال سکا۔ اس لئے آئندہ ماہ میں جبکہ گرمی کی شدت ختم ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ بارش بھی شروع ہو جائے گی۔ تو میں حیدر آباد سے دلّی ہوتا ہوا اعظم آباد پہنچوں گا۔ اسی وقت آپ کے مشورہ سے رشتہ کے متعلق کوئی آخری فیصلہ کروں گا۔ روانہ ہونے کے دو روز قبل بذریعہ تار جناب

۹۰۵۵

کو جناب کو مطلع کروں گا۔

خط کا مضمون سن کر مختار صاحب نے خوش ہو کر کہا "جب آپ ہی کے مشورہ
پر انہوں نے ان کو موقوف رکھا ہے تو یقینی آپ اپنے بھتیجے رجو سلمہ کے سوا دوسری
رائے دے ہی نہیں سکتے۔ گھر پہنچ کر اپنے صاحبزادہ سلمہ کو یہ مژدہ جاں بخش
علی گڑھ لکھ بھیجا، کہ بہنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد خدا نے ایک ایسی جگہ تمہاری
نسبت ٹھہرائی ہے جس کا وہم و گمان بھی مجھے نہیں تھا، عزت وجاہت
کے ساتھ ساتھ کافی دولت بھی ہے، دعا ہے کہ اگلے امتحان میں خدا آنعزیز
کو انڈر گرایجویٹ سے گرایجویٹ بنائے، تاکہ خاندان کا نام روشن ہو۔

جولائی کی تعطیل میں جب طلبہ علی گڑھ سے گھر روانہ ہونے لگے تو میاں
رجو اور ان کے ساتھی احسان، لطیف، مجتبٰی ان چاروں کی رائے ہوئی کہ راستہ
میں ایک روز کے لئے بنارس ٹھہر کر صبح بنارس کی بھی سیر کرنی چاہیئے۔ چنانچہ
علی گڑھ سے روانہ ہو کر یہ چاروں بنارس پہنچے، اور اسٹیشن کے قریب ہی
ایک ہوٹل میں کل سامان رکھ کر غسل اور ناشتہ چا سے فرصت کر کے پانچ بجے
شام کو قیام گاہ پر واپس آئے اور پھر پانچ ہی بجے صبح کو بستر سے اٹھنے کے
ساتھ ہی ضروریات سے فارغ ہو کر راج گھاٹ پہنچے۔ وہاں ایک کشتی کرایہ
کر کے گھاٹ کے کنارے کنارے حسینان بنارس کے غسل کا نظارہ کرنے کے
بعد نو بجے کے قریب کنارے گھاٹ پر کشتی سے اتر کر جو شہر کی سیر گشتی شروع کی
تو پھر تقریباً گیارہ بجے شب کو اپنی جائے قیام پر پہنچے۔ غرض دو روز تک

دن عید اور شب برات منا کر تیسرے روز بنارس سے روانہ ہو کر مغل سرائے
اسٹیشن پر پہنچے۔ کلکتہ جانے والی پنجاب میل کے کھلنے میں چند ہی منٹ باقی تھے۔
یہ چاروں بنارس والی ٹرین سے اُتر کر اس میں سوار ہونے کے لیے کسی ایسے
ڈبہ کی تلاش میں جس میں آرام سے بیٹھ سکیں، پلیٹ فارم پر اِدھر اُدھر
گشت کرنے لگے۔ مگر انٹر کے کل ڈبے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ مجبوراً
ایسے خانہ کو دیکھ کر جس میں نسبتاً آدمی کم تھے، میاں رجو نے اپنے ساتھیوں
سے کہا کہ وقت کم ہے چلو اسی میں اسباب رکھواؤ۔ لئیق نے کہا مگر دیکھا آپ
نے کوئی ایسا بھلا آدمی اس میں ہے جس سے بات بھی ہم لوگ کر سکیں۔ وہ
دیکھئے ایک طرف ایک پنڈت جی جیسے دا پگڑی سر پہ دھرے براجمان ہیں
اور وہاں اس کونہ میں ملاحظہ فرمائیے، کوئی مولانا یا شاہ صاحب مع ریش اقدس
کے رونق افروز ہیں، جو یقینی ہم لوگوں کی آزادانہ گفتگو اور ہنسی مذاق میں حارج
ہوں گے۔ میرے خیال میں ان غیر جنس لوگوں ساتھ سفر تکلیف دہ ہو جائیگا۔
آگے کوئی دوسرا ڈبہ تلاش کرنا چاہیے۔" مسٹر رجو نے کہا "یہ لوگ تو واقعی سفر
کی دلچسپی کے سامان ہیں۔ ان پنڈت اور مولوی سے چھیڑ کر باتیں کرنے میں
بڑا لطف آئے گا۔ دیکھو تو کیسی دل لگی رہتی ہے۔" چونکہ اور خانوں میں جگہ
بھی نہیں تھی اور وقت بھی کم تھا، اس لیے مسٹر رجو کے مشورہ پر عمل کر کے چاروں
مع اسباب اسی خانہ میں دھنس پڑے۔ ڈبہ کے اندر داخل ہوتے ہی احسان
نے پنڈت جی کو چھیڑ کر کہا "مہاراج! ذرا پترا بچار کر کہئے تو ہم لوگ امتحان میں
پاس ہوں گے یا نہیں؟" پنڈت جی نے کہا کہ میں کوئی جوتشی نہیں ہوں، ہندی

ہفتیہ سیلون کے پرچارک کا کام کرتا ہوں۔

اس لٹریری تذکرے کے خشک جواب میں کوئی دلبستگی کا سامان نہ دیکھ کر مسٹر دیجہ چھیڑ خوانی کی غرض سے منقطع صورت صاحب کے پاس پہنچ کر نہایت ہی فراخت کے ساتھ السلام علیکم کہ کر دونوں ہاتھ مصافحہ کے لئے بڑھا دیئے ان حضرت کو کیا خبر کہ میرے ساتھ تمسخر کیا جا رہا ہے، مصافحہ کرنے کے بعد اخلاقاً جگہ بنا کر اپنے بنچ پر بیٹھنے کو کہا، مسٹر دیجہ اسی غرض سے ان کے پاس پہنچے ہی تھی، نہایت ہی مؤدبانہ صورت بنا کر شرارت آمیز سوالات شروع کر دیئے۔

مسٹر دیجہ:۔ غالباً جناب کسی مسجد کے پیش امام یا کسی خانقاہ کے سجادہ نشیں ہیں۔

منقطع صورت:۔ اس حسن ظن کا شکریہ! لیکن خاکسار کے متعلق اس خوش خیالی کی بظاہر کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔

مسٹر دیجہ:۔ چونکہ آج کل روشن خیال اور تعلیم یافتہ طبقہ کے خوف سے داڑھیوں کی جائے پناہ مسجدیں اور خانقاہیں رہ گئی ہیں، اس لئے ممکن ہے میرا خیال صحیح نہ ہو، مگر قیاس کی بنیاد غلط نہیں، بہرحال اتنی بڑی لانبی داڑھی کی غور و پرداخت میں زیادہ وقت صرف ہوتا ہو گا، اور روزانہ کنگھی کرنے میں کافی زحمت ہوتی ہو گی۔

منقطع صورت:۔ جی اس سے بہت ہی کم جتنی بلاناغہ روزانہ بنو کرنے اور استرہ یا سیفٹی ریزر سے برابر گالوں کو کھرچتے رہنے میں زحمت اٹھانی

پڑتی ہے۔
مسٹر رجو:۔ معاف کیجئے گا حضرت! ممکن ہے کسی زمانہ میں کفایت شعاری کو مدِنظر رکھتے ہوئے حجاموں سے پیسے بچانے کے لئے داڑھی رکھنے کا رواج ہو مگر اس ترقی اور فارغ البالی کے زمانہ میں جبکہ داڑھی کیا مونچھ تک رکھنی معیوب ہو، اتنی بڑی لمبی چوڑی داڑھی لگائے رکھنے کی کوئی معقول وجہ نہیں معلوم ہوتی۔
مقطع صورت:۔ صحیح فرمایا، لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ آج ہی داڑھی رکھنے کی زیادہ ضرورت ہے، کیونکہ مغربی تعلیم اور تہذیب کی بدولت، ہمت، شجاعت، جوانمردی، بہادری جیسی مردانہ خصوصیات کھوکر ہم لوگ عورتوں کی طرح صرف بزدل ہی نہیں بن گئے، بلکہ زنانہ وضع قطع بنا و سنگار فیشن کے شوق کے باعث رفتہ رفتہ جنس لطیف کے زمرہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ موجودہ حالت میں مردوں اور عورتوں میں امتیاز کے لئے لے دے کے ایک داڑھی ہی رہ گئی ہے، اب ان زنانہ عادات و خصائل کے ساتھ ساتھ داڑھی مونچھ صاف کر کے صورت بھی زنانہ بنالینا کہاں تک مناسب ہے؟
مسٹر رجو:۔ جناب کو شاید معلوم نہیں کہ عام طور سے روشن خیال طبقہ اور خاص کر علی گڈھ کالج کے تعلیم یافتوں کا خیال ہے کہ داڑھی اور عقل دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔
مقطع صورت:۔ علی گڈھ کالج کی بنا رکھنے کی حماقت غالباً داڑھی ہی رکھنے کے باعث سر سید سے ہوئی۔

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

مسٹر رجو :- جناب کو شاید اس سے انکار نہیں کہ داڑھی والوں اور موجودہ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں صرف فرق یہ ہے کہ یہ روشن خیال جو کرتے ہیں وہ کھلم کھلا ڈنکے کی چوٹ اور رئیل حضرات داڑھی کی ٹٹی کی آڑ بنا تے ہیں۔

منقطع صورت :- لیکن اکبر الہ آبادی کی وہ رباعی شاید آپ نے نہیں سُنی جس کا آخری مصرع غالباً یہ ہے۔

واللہ کہ بے حیا سے مکار اچھا

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ گاڑی یکایک آرہ اسٹیشن پر آکر ٹھہری۔ مسٹر رجو سلسلہ گفتگو منقطع کر کے ڈبے سے نکل کر پلیٹ فارم پر چہل قدمی کی غرض سے اپنے دوستوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے اتر آئے۔

مسٹر رجو :- کہو یار کس خوبصورتی کے ساتھ تجاہل عارفانہ سے میں نے ان کی داڑھی کی گت بنائی اور کیسی کیسی پر مذاق چٹکیاں لیں۔

احسان :- مگر ان پھبتیوں کے باوجود ان حضرت کا نہ بگڑنا تعجب انگیز ہے۔

مجتبیٰ :- معلوم ہوتا ہے کہ اس غریب نے تمسخر کو سمجھا ہی نہیں، ورنہ دوسرا کوئی ہوتا تو داڑھی کی توہین پر غصہ سے داڑھی منہ میں رکھ کر چبانے لگتا۔

لئیق :- یوں آپ اُسے احمق سمجھیں تو اور بات ہے، ورنہ گفتگو سے تو کافی واقفیت کا پتہ چلتا ہے۔

مسٹر رجو :- آخر صورت مولوی کی سی ہے تو یقینی عربی یا کم سے کم

فارسی یا اُردو یہ شخص ضرور جانتا ہوگا۔ اور اُردو اخبارات و رسائل کے دیکھنے
کے باعث کچھ نہ کچھ واقفیت ہو ہی جاتی ہے اور یہ کوئی قابلیت کی دلیل نہیں۔
یہاں تک گفتگو پہنچی تھی کہ انجن نے سیٹی دی اور فوراً یہ چاروں اپنے ڈبے
میں جو داخل ہوئے تو دیکھا کہ یہ حضرت اپنے بنچ پر جائے نماز وغیرہ بچھا کر نماز
پڑھ رہے ہیں۔ مجبوراً یہ چاروں دوسرے بنچ پر بیٹھ گئے۔ نماز سے فارغ ہونے
کے بعد انہوں نے ہینڈ بیگ سے ایک چھوٹی سی حمائل شریف نکال کر تلاوت
شروع کر دی۔ میاں رجو نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ بیکار چپ بیٹھے رہنا
مناسب نہیں، کچھ گانا ہی شروع کر دیا جائے، چنانچہ پہلے جمیل نے گایا۔
نماز کیسی کہاں کا روزہ ابھی تو شغل شراب ہی ہے
اس کے بعد مسٹر رجو نے داغ کی وہ غزل گائی، جس کا مشہور مصرع زبان زد
عوام ہے۔ ع

مٹی کی بھی ملے تو روا ہے شراب میں

بعد ازاں لیئق نے ایک ٹھمری اور احسان نے دادرہ گایا۔ غرض ادھر
تلاوت اور ادھر موسیقیت، اس وقت تک جاری رہی، جب تک کہ
گاڑی دانا پور اسٹیشن پر آ کر نہ رکی۔ چونکہ باقی پورا ایک ہی اسٹیشن باقی رہ
گیا تھا اس لیے مقطع صورت صاحب نے حمائل کو تہ کر کے ہینڈ بیگ
میں رکھا اور سامان کی درستگی میں مصروف ہو گئے۔ میاں رجو حسب عادت
اپنے دوستوں کے ساتھ پلیٹ فارم پر مٹر گشتی میں مصروف ہو گئے۔ انجن نے
جیسے ہی سیٹی دی، حسب معمول اپنے ڈبے میں آ کر جو داخل ہوئے تو دیکھا کہ مقول

کے ایک پرانے دوست آکر بیٹھے ہوئے ہیں۔ علیک سلیک اور بہت سی اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد جب اس نو وارد دوست نے میاں رجو سے مقطع صورت کی طرف اشارہ کرکے مسکراتے ہوئے پوچھا کہ یہ خواجہ خضر صاحب کہاں سے ساتھ ہو گئے؟ مسٹر رجو نے اس خیال سے کہ یہ پٹیل حضرت سمجھ نہ سکیں، انگریزی زبان میں جواب دیا کہ یہ دلچسپ جانور مغل سرائے سے ہم لوگوں کی دلچسپی کا سامان بنا ہوا ہے، ہم لوگوں نے خوب ہی اسے اُلو بنایا، مگر بیچارہ توتے ہم سب کی باتوں کو سمجھ نہ سکا۔ یہ جملہ ابھی پورا بھی نہیں ہوا تھا کہ بانکی پور پلیٹ فارم کے حدود کے اندر گاڑی داخل ہوئی۔ مسٹر رجو نے کھڑکی سے باہر نکال کر جب پلیٹ فارم پر نظر دوڑائی تو دیکھا کہ ان کے والد مختار صاحب اور مولوی عبدالقیوم اور نیز ان کے ساتھ اور دو ایک آدمی دھیار کے اسٹال کے قریب کھڑے سامنے سے ہر گزرنے والے ڈبے کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ جس خانہ میں مسٹر رجو اور ان کے ساتھی بیٹھے تھے، جیسے ہی سامنے سے گزرا، سب کے سب لپکے اور چند قدم ساتھ چلنے کے بعد گاڑی رکنے کے ساتھ ہی دروازہ کا پٹ کھول کر یکے بادیگرے ڈبے کے اندر گھس آئے سب سے پہلے مختار صاحب السلام علیکم کہتے ہوئے انہیں مقطع صورت صاحب کی طرف دونوں ہاتھ معانقہ کے لئے پھیلائے ہوئے آگے بڑھے اور وہ یہ "من تو شدم تو من شدی" بن کر ان سے چمٹے رہے۔ اس کے بعد وکیل صاحب کو بغل گیر ہونے کا موقع دینے کے لئے جو مختار صاحب نے اس جگہ سے ہٹ کر رُخ دوسری طرف پھیرا تو اپنے صاحبزادہ سلمہ پر نظر پڑتے ہی خوش ہو کر فرمانے

لگے" وکیل صاحب لیجئے عزیزم رجّو سلّمہ بھی اسی خانہ میں بیٹھے ہوئے ہیں ؟"
صاحبزادہ سے مخاطب ہو کر فرمانے لگے" ادھر آئیے، اپنے حیدرآبادی چچا سے
ملئے - پروفیسر رضوی صاحب ام، اے لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی آپ ہی ہیں ؟"
یہ سن کر میاں رجّو کی حالت کاٹو تو لہو نہیں بدن میں، فوری طور پر اور کچھ سمجھ
میں بات نہیں آئی - ادھر مختار صاحب پروفیسر رضوی سے ملانے کے لئے
پاس بلاتے رہے اور اُدھر مسٹر رجّو ڈبّے سے چھلانگ مار کر پلیٹ فارم پر
اور وہاں سے یہ جا وہ جا نظروں سے غائب ہو گئے - صاحبزادہ کی اس
ناشائستہ حرکت پر مختار صاحب کو بہت غصّہ آیا مگر کرتے کیا، پروفیسر رضوی
نے جب پوچھا کہ یہ آپ کے صاحبزادہ تھے تو اپنی خفّت مٹانے کے لئے
مختار صاحب نے کہا جی ہاں بچپن ہی سے نہایت شرمیلے واقع ہوئے ہیں،
دیکھئے نا انڈر گراجویٹ ہو جانے پر بھی ابھی تک اپنے بزرگوں کے سامنے آتے
ہوئے شرماتے ہیں" یہ سن کر پروفیسر صاحب صرف مسکرا کر رہ گئے -

اس مختصر گفتگو کے بعد مولوی عبدالقیوم صاحب پروفیسر رضوی کو
لئے ہوئے اسٹیشن سے اپنے مکان کی طرف روانہ ہوئے اور مختار صاحب
غصّہ میں وہاں سے سیدھے اپنے گھر پہنچے، دیکھا کہ صاحبزادہ سلّمہ اپنی والدہ سے
کچھ باتیں کر رہے ہیں - مسٹر رجّو پر نظر پڑتے ہی بگڑ کر فرمانے لگے -

مختار صاحب :- اتنے آدمیوں کے سامنے گرہ کٹوں کی طرح ڈبے سے اچک کے
بے تحاشا بھاگ جانا یہ کونسی حرکت ہوئی اور تو اور، خود پروفیسر رضوی صاحب
دل میں کیا کہتے ہوں گے، کہ یہ کیسا اٹھائی گیرا ہے -

مسٹر رَچّو:۔ مجھے کیا خبر۔ میں کوئی ولی اللہ تھوڑا ہی ہوں کہ اتنی لمبی چوڑی داڑھی کے باوجود سمجھ جاتا کہ یہ انگریزی کے تعلیم یافتہ ہی نہیں بلکہ پروفیسر بھی ہیں اور انہیں کے یہاں رشتہ کی بات چیت ہو رہی ہے۔

مختار صاحب:۔ مگر یہ آخر سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے کی وجہ؟

مسٹر رچو:۔ اصل بات یہ ہے کہ ان سے داڑھی کے متعلق کچھ بحث چھڑ گئی تھی اور یہ حضرت کچھ خفیف سے ہو گئے تھے۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ یہی پروفیسر رضوی ہیں، تو اس خیال سے آپ لوگوں کے سامنے میری موجودگی کو اپنی خفت نہ سمجھیں، ایک منٹ کے لیے بھی ٹھہرنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔

مختار صاحب۔ بھلا ایسے کٹر مولوی ٹائپ کے آدمی سے داڑھی کی بحث میں اُلجھنے کی کیا ضرورت تھی، یہ تو ساری کی ساری محنت ہی اکارت ہونی چاہتی ہے۔

رچو:۔ میں نے پہلے ہی عرض کیا کہ میں کوئی غیب داں تو تھا نہیں، جیسے ہی آپ نے ان کے یہاں رشتہ کے متعلق خبر دی تھی، ان کا حلیہ یا تصویر آپ بھیج دیتے، تو اس کی نوبت ہی کاہے کو آتی۔

مختار صاحب:۔ خیر دیکھیے کل کی گفتگو سے پورا اندازہ ہی مل جائیگا کہ کیا اثر انہوں نے لیا۔

دوسرے روز مختار صاحب نہایت ہی پر تکلف دعوت کا سامان کر کے اپنے آئندہ ہونے والے سمدھی کو مدعو کرنے کے لیے وکیل صاحب کے یہاں پہنچے، تو رضوی صاحب نے کہا ــــ "ابھی مفتوں میرا قیام یہاں رہے گا اتنی

جلدی کیا ہے کسی اور دوسرے دن دیکھا جائے گا۔

مختار صاحب :- عزیزم رتو سلّہ کی دلی تمنا ہے کہ آپ غریب خانہ پر قدم رنجہ فرما کر ہم لوگوں کی عزت افزائی فرمائیں۔

پروفیسر رضوی :- اچھا وہ آپ کے صاحبزادے ہیں؟

مختار صاحب :- جی ہاں آپ ہی کا غلام ہے۔

پروفیسر رضوی :- وہ پڑھتے کس درجہ میں ہیں۔

مختار صاحب :- آپ کی دعا سے انڈر گرایجویٹ ہیں۔

پروفیسر رضوی :- غالباً وہ علی گڈھ کالج میں وہ تعلیم پا رہے ہیں؟

مختار صاحب :- جی ہاں پانچ چھ سال سے وہیں پڑھ رہے ہیں۔ تعلیمی اخراجات کا خیال نہ کر کے میٹرک پاس کرنے کے بعد ہی میں نے وہاں داخل کر دیا۔

پروفیسر رضوی :- تعجب ہے کہ پانچ چھ سال کے اندر وہ بی اے بھی نہ کر سکے۔

مختار صاحب نے گھبرا کر جلدی سے تاویل کی۔

"۔۔ بات اصل یہ ہے کہ اتفاق سے دو تین سال متواتر عین امتحان کے وقت ہی بیمار پڑ گئے، ورنہ ماشاء اللہ رتو سلّہ بہت ہی محنتی اور ذہین ہیں۔

پروفیسر رضوی :- معلوم ہوتا ہے کہ صحت ان کی اچھی نہیں ہے۔

مختار صاحب :- (کچھ پریشان ہو کر) نہیں جناب بچپن ہی سے نہایت

ہی ہلدی واقع ہوئے ہیں، کرکٹ اور فٹ بال کے کھیلوں میں بہت زیادہ دلچسپی لینے کی وجہ سے ان کی تندرستی اور بھی اچھی ہے۔ باقی رہی بیماری، تو الانسان مرکب من الخطاء والنسیان کے مطابق بھول چوک سے کبھی نزلہ زکام ہو ہی جاتا ہے۔

پروفیسر رضوی:۔ جب کرکٹ وغیرہ کا انہیں زیادہ شوق ہے تو اس میں کافی دلچسپی لینے کی وجہ سے یقینی زیادہ وقت انہیں کھیلوں میں صرف ہوتا ہوگا، اور کئی سال تک فیل ہونے کا سبب غالباً یہی کھیل کود کا شوق ہے۔

مختار صاحب:۔ نہیں یہ بات ہرگز نہیں، پڑھنے میں کافی وقت صرف کرتے ہیں اور تعلیم کو تو انہوں نے زندگی کا لازمی جزو بنا رکھا ہے، یہ کرکٹ وغیرہ کو تو گویا سکنڈ لینگویج سمجھئے۔

پروفیسر رضوی:۔ آپ کے برخوردار کا سن کیا ہوگا؟

یہ سوچ کر کہ اگر واقعی صحیح عمر بتلادی جائے تو سن کی کمی بیشی کہیں رشتہ میں رکاوٹ نہ ڈال دے۔ اس لئے اس کا پہلو بچا کر مختار صاحب نے کہا:۔ جناب کی صاحبزادی سلمہا سے دو چار سال زیادہ ہی سن ہوگا!

پروفیسر رضوی:۔ آخر کے سال کی عمر ہے؟

مختار صاحب:۔ (احتیاطاً گھٹا کر) یہی سولہ سترہ کے لگ بھگ ہوگی۔

پروفیسر رضوی:۔ آپ کے دانستہ بیس بائیس سال کی عمر کا کوئی لڑکا

برادری میں ہو تو مجھے خبر دیجیے گا۔

مختار صاحب:۔ (بوکھلا کر) سولہ سترہ سال جو میں نے کہا یہ تو اسکول کی عمر ہے، ورنہ دراصل تو اسی ماہ میں پورے بائیس سال ہوتے ہیں۔

مختصر یہ کہ جب مختار صاحب نے بوکھلائے ہوئے گواہوں کی طرح پروفیسر رضوی کے جرح نما سوالوں کا مضحکہ خیز جواب دینا شروع کر دیا تو رضوی صاحب نے اس سلسلۂ گفتگو کو بند کر کے کہا کہ پھر انشاء اللہ کل اس پر تبادلۂ خیال ہو گا۔ مختار صاحب کے رخصت ہو جانے کے بعد جب مولوی عبدالقیوم صاحب نے رضوی صاحب سے دعوت کے انکار کی وجہ پوچھی، تو مخلصانہ آزردگی کے ساتھ کہا کہ آپ کی ذات سے مجھے ایسی امید نہ تھی، آپ نے تو میری بچی کو گویا کنوئیں میں ڈھکیل دینے کا سامان کر دیا تھا۔ وکیل صاحب نے کہا میں نے خدا میں تو اپنی کوئی خاص رائے ظاہر نہیں کی تھی، اور اگر کرتا بھی تو کوئی ایسی قابل الزام بات نہیں تھی، کیونکہ لڑکا آخر تعلیم یافتہ انڈر گریجو ہے۔ پروفیسر صاحب نے کہا کہ اگر یونیورسٹی ایسے ہی انڈر گریجویٹ تیار کرتی ہے تو سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ یونیورسٹی اور اس کے انڈر گریجویٹ طلبہ پر خدا رحم کرے۔

اس کے بعد ریل پر کے پورے واقعات بیان کرنے کے بعد کہا کہ ان انڈر گریجویٹ صاحبزادہ کی بدتمیزیوں کو نہایت ہی تحمل کے ساتھ اس لئے برداشت کرتا رہا، تاکہ ان نئے تعلیم یافتوں کی ذہنیت کا اچھی طرح مطالعہ کر سکوں۔ میاں رجو اور ان کے ساتھی مجھے ذلیل کرنے اور

اور بیوقوف بنانے کی کامیاب کوشش پر خوش ہو رہے تھے اور میرا دل ان کی قابل رحم حالت پر خون کے آنسو رو رہا تھا۔ ازراہ کرم مختار صاحب سے صاف کہہ دیجئے کہ اس رشتہ کے متعلق کوئی تذکرہ نہ کریں۔ وکیل صاحب کی یہ ہمت تو نہ پڑی کہ اس قدر صاف کہہ کر مختار صاحب کی دل شکنی کریں، البتہ یہ کہہ کر ٹال دیا کہ پروفیسر رضوی صاحب حیدر آباد واپس جاکر اپنے خاص لوگوں سے مشورہ کرکے آخری رائے سے بذریعہ خط آگاہ کریں گے۔

مختار صاحب لاکھ خود غرض اور سادہ لوح سہی، مگر انداز گفتگو سے سمجھ گئے۔ یہ بیل منڈھے چڑھتے نظر نہیں آتی۔ مایوس ہو کر حسب دستور اسی طرح اور دوسری جگہ رشتہ کی سلسلہ جنبانی شروع کر دی۔ لیکن اب کے وقت یہ آپڑی کہ پروفیسر رضوی کے ساتھ جو بیان رچ گئے ہیں، پر بدتمیزیاں کی گئیں۔ مولوی عبدالقیوم صاحب نے اس واقعہ کا بار لائبریری میں ایک روز تذکرہ کر دیا۔ رفتہ رفتہ یہاں تک پھیلا کہ اب کوئی مختار صاحب سے رشتہ کی گفتگو کرنے تک کا روادار نہیں۔ جہاں کہیں یہ پیام بھیجتے یہی جواب ملتا کہ ایسی جگہ رشتہ کرکے کون اپنی عزت و آبرو کھوئے۔

اس کے بعد کی اور کوئی زیادہ تفصیلی حالت کی خبر نہیں۔ پروفیسر رضوی صاحب کے متعلق یہ البتہ معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنی بچی کی نسبت اپنی برادری کے ایک ایسے غریب پسر لڑکے کے ساتھ ٹھہرائی ہے جس نے صرف میٹرک تک پڑھ کر انڈسٹریل کی امداد سے مانپور کے نسری کپڑوں کی ایجنسی کا کام شروع کر دیا تھا۔ باقی رہے مختار صاحب کے انڈر گریجویٹ صاحبزادے

تو اُن کا رشتہ کہاں ہوا، اس کی کچھ واقفیت نہیں یونہی کچھ اُڑتی پڑتی سی خبر معلوم ہوئی کہ مسٹر رتجو نے آج کل ایک "اینٹی میرج ایسوسی ایشن" قائم کی ہے جس کا مقصد شادی کے خلاف پروپگنڈا کرنا ہے۔ بہت سے انڈر گراجویٹ طلبہ اس کے سرگرم رکن ہیں کہ صرف زبانی ہی نہیں، بلکہ اس میں عملی حصہ بھی لے رہے ہیں۔

میری دعا ہے کہ خدا اس ایسوسی ایشن کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے! کیونکہ اور نہیں تو کم سے کم اس سے یہ فائدہ ضرور ہوگا کہ وہ انڈر گراجویٹ طلبہ جو اپنے خاندان کے لئے وبال جان بنے ہوئے ہیں شادی کرکے اپنی بیوی اور سسرال والوں کے لئے عذاب جان نہ بن سکیں گے۔

پروفیسر سیّد محمّد محسن

پیدائش — بانکی پور، پٹنہ – ۱۹۱۰ء

تعلیم — ایم۔ اے (فلسفہ) پٹنہ یونیورسٹی
پی۔ ایچ۔ ڈی (نفسیات) اڈنبرا

بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں، جن کی روشنی میں آپ بہت کچھ دیکھ اور پہچان بھی سکتے ہیں۔ یہاں چراغ کی قطعاً حاجت نہیں، ایک واقعہ سنئے اور مخاطب سے ملئے۔

پٹنہ کالج کے طلبہ سناتے ہیں، کئی سال کی بات ہے ——

ایک دوپہر کو کالج کے بھرے ہوئے اسٹاف روم میں ایک مشہور و معروف پروفیسر نے اچانک ایک استعجاب خیز بات پیش کی۔ مدرسین وقفۂ راحت میں چائے اور قہوہ سے شغل کر رہے تھے کہ پروفیسر موصوف نے ناگہاں اس جملے سے سبھوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا — "آپ صاحبان یہ جان کر محظوظ ہوں گے کہ ہمارے کالج میں طالبات نے بڑی کد و کاوش اور نقد و نگاہ کے بعد ہم میں سے دو حضرات کو کالج کا سب سے خوبصورت پروفیسر منتخب کیا ہے"۔

سنتے ہی سبھوں کے ہاتھ کی پیالیاں رک گئیں اور ہر فرد کی نظر اس طرف بے اختیار اٹھ گئی۔ "صرف دو" پروفیسر صاحب نے خود چائے کا لطف لیتے ہوئے مزہ لے لے کر بیان کیا "یہ خوبصورت ترین پروفیسر ہم میں سے صرف دو منتخب کیے گئے ہیں" مدرسین کی آنکھیں چند لمحوں تک ان کے جانب لگی رہیں۔ پھر

پھر آہستہ آہستہ حیرت و مسرت کی مخلوط کیفیتوں سمیت یہ ادھر اُدھر ایک دوسرے کا جائزہ لینے لگیں۔ پروفیسر صاحب ہلکے تبسم کے ساتھ سبھوں پر ایک ہلکی ہلکی نگاہ ڈالنے لگے ——— کہا جاتا ہے کہ پروفیسر وہاکو دفعتاً کھانسی اُٹھی، پروفیسر محسن کی انگلیوں میں چائے کی پیالی ناگہاں کپکپانے لگی اور پروفیسر صاحب کے متحرک دیدے اچانک صامت ہو گئے! اشارہ مثبت پڑا اور اسٹاف روم بلند قہقہوں سے یکایک گونج اُٹھا جس میں رشک اور تہدید دونوں شامل تھے۔

آناً فاناً طالبات اور اسٹاف روم کا یہ واقعہ سرعت سے ہر جگہ جا پھیلا۔ لڑکوں کو علم ہوا، کالج میں اُڑا اور پروفیسروں کے گھروں تک جا لگا۔ طلبہ کہتے ہیں کہ اس دن کے بعد سے پروفیسر محسن کبھی دیدہ زیب خوشنما اور حسین سوٹوں میں نہ دیکھے گئے۔ گھر کی بات ہے، کوئی کیا کہے اور کیسے کہے کہ پروفیسر محسن کا یہ شعوری ردِّ عمل محترمہ محسن صاحبہ کے لئے خطرناک زیادہ ہے محفوظ کم۔ کون انکار کرے گا، بھلا ولی کا قول ہے :-

نہیں محتاج زیور کا جسے خوبی خدا دیوے

کہ دیکھو خوشنما لگتا ہے کیسا چاند بن گہنا

درمیانہ قد، دراز پیشانی اور آنکھوں پر سیاہ عینک گورے چہرے پر سہاگا کا کام کرتی ہے۔ کم سن اور کم سخن ہونے کے باوجود مِس کی شخصیت سے ایک عظمت اور وقار ٹپکتی ہے، جوان کے جمال میں مزید اضافہ کرتی ہے۔ محسن بھی

مل کر اور ان سے گفتگو کر کے آپ راحت محسوس کریں گے، جیسے آپ نے ایسی باتیں جان لیں جو آپ بالکل نہ جانتے تھے اور جن کے نہ جانے بغیر آپ کچھ نہ جان سکتے تھے۔ اولین ملاقات میں آپ ان کی شخصیت سے متاثر ہوں گے۔ بھولا بھالا ظاہری جمال اور تدبر کے ساتھ خموشی اور خشک مزاج سنجیدگی نظر آئے گی۔ نفسیات اور فلسفہ و منطق میں دسترس رکھنے والا یہ کامیاب پروفیسر بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے جس سے ہر لمحہ انہماک، استغراق اور متانت جھلکتی رہتی ہے لیکن محسن کے ساتھ چند پر اطمینان ساعتیں گذار کر آپ ان کی علمیت و صلاحیت سے محظوظ ہو جائیں گے۔ بے تصنع خلوص، پاکیزہ طبیعت اور سنجیدہ مذاق کے ساتھ آپ کو ان کی سیرت میں جیتا جاگتا انداز فکر اور قابل قدر تدبیر کا اندازہ ہوگا۔ استعجابی انداز میں آپ ان سے مسلسل و متواتر کتنی ان کہی انجانی اور تاریک گوشوں والی بے شمار دبی ہوئی سی باتیں پوچھنے لگیں گے۔ محسن نیم تبسم بڑی خوشی کے ساتھ آپ کی ذہنی الجھنوں کو سلجھانے اور آپ کے استفہامات کو آسودہ کرتے جائیں گے۔ گھنٹے کی گھنٹوں میں ملتے جائیں گے۔ آپ کا ان سے الگ ہونے کو ذرا جی نہ چاہے گا، اور مسکراتے ہوئے محسن، آپ سے خواستگار معذرت ہوں گے۔ کتابوں اور علمی گفتگو کے بعد زندگی میں محسن کی محبوب ترین شے محسنہ ہیں ——————

——————

اختر اورینوی اپنی ایک تالیف "افسانے" میں لکھتے ہیں:—

"محسن صاحب ہندوستان بھر میں متعارف ہیں۔ آپ کی

افسانے ساقی مرحوم دہلی میں شائع ہوئے ہیں اور کئی معاصر
پٹنہ میں - آپ پٹنہ کالج میں فلسفہ و نفسیات کے پروفیسر ہیں
آپ نوجوان تو اب نہیں رہے، پیر جواں ضرور ہیں، اور
آپ کا انداز نگارش بھی جوان ہے - ارباب نفسیات نے
انسانی دماغ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے شعوری اور تحت الشعوری
تحت الشعوری دماغ کی کارفرمائیاں عجیب و غریب
ہوتی ہیں - اس کے گورکھ دھندے سمجھ میں نہیں آتے انسانی
کردار اور واقعات و سانحات کو تحت الشعوری دماغ
نہایت ہی خطرناک طور پر متاثر کرتا ہے - محسن صاحب زندگی
کے اسی پہلو کو مرکزی طور پر پیش کرتے ہیں، اس کے ساتھ
ساتھ آپ خارجی سماجی مسئلوں کو بھی نفسی تجزیہ و تحلیل
کے ساتھ سامنے لاتے ہیں ۔"

ادب ہند کے یہ تعارفی جملے ہیں - اردو افسانوں کو آپ اگر قریب
سے ان کی نوعیت کے بموجب دیکھیں تو آپ کو تین افسانہ نگار ایسے نظر آئینگے
جن کے افسانے سبھوں سے الگ اور بہت پرے ہیں، مفتی، محسن، عسکری،
یہ تین فنکار در حقیقت ٹھیٹھ نفسیاتی افسانہ نگار ہیں، جن کا ہر فن پارہ
کسی گتھی کا PSYCHO-ANALYSIS نفسی تجزیہ ہوتا ہے - بہت ہی
کامیاب جیتا جاگتا اور مفید، مفتی کو مشاہدۂ حیات میسر ہے - عسکری کے
پاس مطالعہ نفسیات ہے اور محسن کے یہاں مشاہدہ و مطالعہ دونوں موجود

ہیں۔ کوئی یقین نہ کرے پر یہ کھلی حقیقت ہے کہ کالج کا یہ کامیاب پروفیسر
ہندوستان کے سب سے بڑے پاگل خانہ میں کئی بار جا چکا ہے اور نمونہ ذوق کا
یہ عالم ہے کہ تقریباً ہر بڑی چھٹی میں محسن MENTAL HOSPITAL
KANKE نہ جانے کتنی زلیخا و عذرا، ٹیگور و ہٹلر اور غالب و شاہ کی
گتھیوں میں اُلجھے رہتے ہیں۔

جنہوں نے ریزۂ مینا مرتبہ شاہ احمد دہلوی، کا مطالعہ کیا ہے
"وہ انوکھی مسکراہٹ" دیکھ کر محسن اور ان کے فن کا اندازہ کر سکتے
ہیں۔ یہ محسن کا پہلا افسانہ ہے۔ جو نہ صرف اُردو بلکہ مشرقی ادب کا ایک
شاہکار ہے اور جسے ہندوستان کی تمام زبانوں نے آناً فاناً ترجمہ کے
ذریعہ اپنے ادب میں محفوظ کر لیا ہے۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں جہاں ملک میں بڑے بڑے انقلابات رونما ہوئے
وہاں ایک سنگین انقلاب محترمہ محسنہ صاحبہ کے ساتھ بھی رونما ہوا ——
محسن کی روانگی اور ان کی تنہائی!! اسکاٹ لینڈ کے ایک معمل خانہ میں
یورپ کے مشہور ماہر نفسیات ہربٹ ریڈ کے زیر نگرانی دو برس تک محسن نفسیات میں تحقیقی
کام کرتے رہے۔ واپس آئے تو یہ ڈاکٹر تھے۔ خداوند کریم کی اس دنیا کے ناقص میں
ذہنی مریضوں کی کمی نہیں۔ قدرت نے انہیں خوب موقع دیا۔ ان کی حکمت میں مریض کے
احوال و کوائف سے زیادہ اس کے افعال اور چال چلن کو دخل ہے۔ محسن اب نفسیات
کے ماہر کے ساتھ ایک "امن بخش حکیم" بھی ہیں ——!!

کمینہ

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے، جب بھوک لگتے ہوئے بھی کھانا نہیں کھایا جاتا۔ جب تک کھانا سامنے نہیں ہوتا پیٹ میں آگ سی لگی ہوئی ہے لیکن جب اچھے سے اچھا کھانا بھی سامنے لا کر رکھ دیا جاتا ہے تو کھانے کی طرف سے اس طرح جی بھر جاتا ہے، جیسے نومشق شرابی کا دل خمار ٹوٹتے وقت شراب سے۔ لیکن یہ سب پیٹ کی بیماری میں ہوتا ہے۔ اسے پیٹ کی بیماری نہ تھی۔ اس کی صحت کافی اچھی تھی اور گو اسے کھانے سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن وہ وقت پر بھر پیٹ ضرور کھا لیا کرتا تھا۔ اُسے تو من کا روگ تھا۔ اس کے من میں ایک طوفان سا اُٹھتا رہتا۔ ایک مستقل اضطراب کی کیفیت، وہ اپنے اندر ایک تڑپتی ہوئی ہوک سنا کرتا تھا، جیسے خلا

میں کسی چیز کے گرنے سے ایک تھرتھراتی ہوئی آواز پیدا ہو جاتی ہو۔ دوستوں کی مدد صحبت میں جب مزہ مزہ کی باتیں ہوتی رہتیں، حسن و عشق کے قصے دہرائے جاتے، اس وقت بھی اس کے کان اس کے دل کی آواز پر لگ جاتے، جیسے سنسان میدان میں کوئی دور سے اسے پکارنے لگا ہو۔ اس کا خیال ہٹ جاتا اور وہ کھویا کھویا سا نظر آنے لگتا۔ اسے کتابوں کا کافی شوق تھا اور وہ کبھی کبھی دن دن بھر کتابیں پڑھتا رہتا لیکن کتابوں کی دلچسپیاں اسے صرف عارضی سکون بخش سکتی تھیں، جس طرح انقلابی داستانیں مزدور کے دل تھوڑی دیر کے لئے موہ لیتی ہیں۔ وہ اکثر کتابوں سے سخت بیزار ہونے لگتا۔ میز پر اس کے آگے کتابوں کے انبار لگے ہوتے اور وہ گھنٹوں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھا رہتا۔ خالی الذہن لیکن دل میں اضطراب کے نشتر محسوس کرتا ہوا۔ جیسے اس کی رگوں میں درد اٹھ رہا ہو، وہ کوئی کتاب اٹھا لیتا۔ اس کی نظریں دو دو تین تین صفحوں کا طول و عرض طے کر لیتیں۔ لیکن اس کا دماغ جیسے کند ہو گیا ہوتا، فہم و ادراک کی قوتوں سے محروم۔ وہ اس کتاب کو پرے ڈال کر دوسری کتاب کھولتا۔ لیکن اس کا حشر بھی پہلی ہی جیسا ہوتا۔ پھر اس کی قوت فیصلہ اس درجہ معطل ہو جاتی کہ وہ بیک وقت دو دو تین تین کتابیں کھول کر رکھتا۔ ایک کی چند سطریں دیکھنے کے بعد اس کی نظر دوسری کی سطروں پر لگ جاتیں اور پھر پلٹ کر پہلی کی جانب۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اس کے من کی کشتی ساحل سے الگ کر بیچ سمندر میں ہچکولے کھا رہی ہو۔

وہ ایک شام کافی دیر تک کھلے میدانوں کے چکر کاٹ کر گھر لوٹ رہا تھا، اور گھر کے پھاٹک میں قدم رکھنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی نگاہ بغل کے کوٹھے پر پڑی - ایک کمسن لڑکی کوٹھے کے برآمدے پر کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی تھی، اس کی نظریں دو چار ہو کر شرما گئیں - وہ اسے سہمی سہمی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی - اس مکان میں چند دن پہلے ایک پنجابی کرایہ دار آئے تھے - یہ پولس کے دفتر میں ملازم تھے -

اسے دوبارہ نظر اُٹھانے کی ہمت نہ ہوئی - گو اس کے پاؤں اضطراری طور پر پھاٹک پر آ کر رک گئے تھے "وہ اُسے کیوں دیکھ رہی تھی - شاید اس کی نظروں کو دھوکا ہوا" اس کا جی چاہتا تھا کہ دوبارہ نظر اُٹھا کر اس کی جانچ کرے - لیکن وہ ایسا نہ کر سکا - اور اپنے مکان میں داخل ہو گیا - لڑکی کا کوٹھا اس کے مکان کی چھت سے صاف دکھائی دیتا تھا - پہلے کرایہ دار نے کوٹھے کے برآمدہ پر چلمن ڈال کر پردہ کر لیا تھا - ان لوگوں نے اس کی ضرورت محسوس نہ کی - پنجاب میں یوں بھی کوئی زیادہ پردہ نہیں -

لڑکی زیادہ وقتوں میں برآمدہ ہی پر بیٹھی رہتی اور وہ چھت پر پہنچ کر اُسے اچھی طرح دیکھ سکتا تھا - وہ گھر والوں کی آنکھیں بچا کر دیوار کی پشت سے لگ کر کھڑا ہو جاتا اور اُسے دیکھنے لگتا - اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے دل کے اندھیارے میں کرن پھوٹ گئی ہو جیسے اس کے من کی آواز فضا میں کھو جانے کے بجائے گونجتی ہوئی اس کے پاس لوٹ آنے لگی ہو۔

رفتہ رفتہ اس کا جی صرف نظروں کی تسکین سے اُکتا گیا اور گفتگو کی آرزو اس کے دل میں کروٹ لینے لگی۔

ایک دن داروغہ جی خاص اس سے ملنے اس کے گھر آئے، وہ ان کی صورت دیکھ کانپ سا گیا۔ اُسے ڈر پیدا ہونے لگا کہ شاید انہوں نے اپنی لڑکی پر نظر ڈالتے اُسے دیکھ لیا ہے اور کچھ کڑوی باتیں کرنے آئے ہیں۔ اس نے ڈرتے ڈرتے انہیں کرسی پیش کی۔ داروغہ جی پہلے ادھر اُدھر کی بے مطلب سی باتیں کرنے لگے۔ اس کا دم الجھنے لگا، وہ ان کی باتوں کا مختصر سے مختصر جواب دے رہا تھا۔ داروغہ جی جب اس کی سائنٹفک کم گوئی اور فلسفیانہ پن سے مطمئن ہو چکے تو اصل مطلب پر آئے "میری لڑکی" اس کا کان کھڑا ہو گیا، گویا کسی نے خطرے کی گھنٹی بجادی ہو" آپ نے تو اسے دیکھا ہی ہوگا۔ آپ سے کون پردہ ہے۔ اور صاحب اپنے یہاں پنجاب میں تو آپ لوگوں کے جیسا پردہ ہے بھی نہیں۔ میں سنتا آیا تھا کہ بہار جیسے شریف مسلمان ہندوستان کے کسی صوبہ میں نہیں پائے جاتے۔ خدا کی قسم یقین مانیے۔ بہار آکر میں بھی اس کا قائل ہو گیا ہوں۔ ہاں صاحب تو میں میرٹھ میں تھا۔ رانو کی باضابطہ پڑھائی ہو رہی تھی۔ نام تو اس کا رادھیکا ہے لیکن ہم لوگ اُسے پیار سے رانو کہتے ہیں۔ پچھلے سال اس نے میٹرک کا امتحان دیا ہوا ہوتا لیکن میں نے یہاں آجانا ہوا اور اس کی پڑھائی ادھوری ہی رہ گئی۔ اب ارادہ ہے کہ اس سال آپ کی یونیورسٹی سے امتحان دلوا دوں۔ اسی مقصد سے تو میں آپ کے پاس اس وقت حاضر ہوا ہوں۔" اس کے چہرہ پر

دمک سی پیدا ہوگئی۔ اس کے دل نے انسپکٹر کا مطلب بھانپ لیا تھا اور اسے انسپکٹر کی بے ربط بے معنی گفتگو میں مزا ملنے لگا تھا۔

"میں نے معلوم ہوا کہ آپ نے اس سال اول درجہ میں ام۔اے پاس کیا ہے۔" انسپکٹر نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بڑا جی خوش ہوا۔ اور وہ بھی فلسفہ جیسے خشک اور مشکل سبجکٹ میں۔ واللہ کمال کیا آپ نے۔ لیکن مانئے آپ دیکھنے میں انٹرمیڈیٹ اسٹوڈنٹ سے زیادہ نہیں معلوم پڑتے۔ اس کمسنی میں آپ نے ام۔اے پاس کیا ہوا ہے۔ واہ واہ۔" انسپکٹر کی آنکھیں اس کے چہرہ کا جائزہ لینے لگیں گویا وہ کمسنی کے علامات ڈھونڈھ کر اپنی حیرت دور کرنا چاہتا ہو۔ وہ شرما گیا۔

"آج کل تو آپ گویا بے شغل ہی ہوں گے۔ ام۔اے کر لیا، وقت آنے سے ملازمت مل ہی جائے گی۔ ڈپٹی کلکٹری تو آپ کی دھری ہے۔ کیا ایج ہے آپ کی؟" "بیسواں سال ہوگا۔ ۱۹۲۶ء سال کی میری پیدائش ہے۔" "آپ سول سروس کے امتحان میں کیوں نہیں بیٹھ جاتے؟ آپ جیسے نہ آئیں گے تو آئے گا کون۔ ہمارا ایک رشتہ دار گذشتہ سال سول سروس میں آیا ہے۔ کوئی خاص بات نہ تھی اس کے اندر۔ ویسے کچھ ایسا محنتی بھی نہ تھا۔ اس کا پڑھنا لکھنا بھی کوئی بہت اچھا نہ تھا۔ آپ ضرور امتحان میں بیٹھئے۔ کامیابی میں شرطیہ کہے دیتا ہوں۔ آخر سول سروس کے امتحان میں رکھا ہی کیا ہے۔ ہاں تو میں کہنا چاہتا تھا کہ ادھر آپ کا بھی کوئی خاص شغل نہ ہوگا۔ یوں تو آپ کے ہاتھ میں ہر وقت کتابیں ہی دیکھتا ہوں۔ آپ جیسے ہونہار جوان کو

دیکھ کر بڑا جی خوش ہوتا ہے میرا" انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی گھنی سیاہ مونچھوں کے پیچھے اس کے خوبصورت اور چمکیلے دانت اس طرح جھانکتے ہوئے معلوم ہوئے جیسے گناہگار کے ارادوں کی تہ میں نیکی کا جذبہ۔

انسپکٹر کی پیچ در پیچ گفتگو سے اس کا دم پھر الجھنے لگا۔ شاید وہ اس کے پاس اپنی بیٹی کی شادی کا پیغام لے کر آئے تھے اس کے دماغ پر سوالنج کی کرنیں بھوٹنے لگیں۔ انسپکٹر نے پھر بولنا شروع کیا" تو میری غرض اتنی ہے کہ آپ اپنے قیمتی وقت کا کچھ حصہ نکال کر رانوں کی پڑھائی کی دیکھ بھال کر لیجئے۔ میں تو آپ کا بڑا احسان مند ہوں گا۔ آپ کو جون سا وقت مناسب ہو ہفتہ میں بس دو ایک دن۔ میں آپ کا وقت زیادہ نہیں برباد کراؤں گا"۔

"مجھے کوئی عذر نہیں" اس نے اضطراری طور پر جواب دیدیا۔ جیسے وہ اس مسئلہ پر پہلے سے غور کر چکا ہو" سات بجے شام کو آپ کے یہاں آسکتا ہوں"۔

"ٹھیک ہے۔ جون سا وقت آپ کو مناسب ہو۔ تو کیوں نہیں آپ آج ہی سے آجائیں۔ میں رانوں سے کہ رکھوں گا۔ وہ کتابیں وغیرہ لے کر تیار رہے گی۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ آپ اسے دیکھ کر بہت خوش ہوں گے"۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا دل اس کی تصدیق کر رہا ہے "پڑھنے کی بڑی شوقین۔ کہتی ہے کہ بابو جی مجھے کسی طرح بی اے تک پڑھوا دو۔ خدا اس کی خواہش پوری کرے۔ میں کو حیثیت آدمی اور پھر اتنے بال بچے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں آج کل پڑھائی میں کتنا خرچ ہے۔ آخر پہلے زمانہ میں بھی تو لوگ جاہل نہ

رہتے تھے۔ کیسے کیسے عالم و دانا اسی ہندوستان میں پیدا ہو گئے۔ آج کل نو پڑھا لکھا کیا ہے، دیوالیہ بنتا ہے۔ اور پھر نتیجہ کچھ نہیں۔ سب آپ جیسے تیز اور ذہین تھوڑے ہی ہیں۔ بی۔ اے پاس کو آج کل پوچھتا کون ہے۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ میرے یہاں ایک ام۔ اے پاس سب انسپکٹر بحالی ہوا ہے"۔

اس نے انسپکٹر کی گفتگو میں گویا اپنی توہین محسوس کی اور اس کے چہرہ کا رنگ پھیکا ہو گیا۔ "جی ہاں" انسپکٹر نے "ہاں" کو کھینچتے ہوئے اور گردن ہلاتے ہوئے کہا ــــ

"درست فرماتے ہیں آپ" اس نے اپنے دل کی کیفیت چھپاتے ہوئے کہا۔

"تو اب اجازت دیجئے" انسپکٹر یہ کہہ کر چلا گیا اور وہ سات بجے شام کو اس کے گھر پہنچ گیا۔

"رانو سے اس کی آنکھیں پہلے ہی دوچار ہو چکی تھیں۔ اس نے رسمی صاحب سلامت کے بعد پڑھائی کے متعلق پوچھ کچھ کی اور ایک معمولی پیشہ ور ٹیوٹر کی طرح اپنا فرض انجام دے کر گھر لوٹ آیا۔

وہ ہفتہ میں دو دن رانو کے گھر جاتا اور بڑے انہماک سے اسے پڑھاتا یہاں تک کہ رانو کا امتحان ختم ہو گیا، اور رانو کے گھر جانے کی کوئی ضرورت باقی نہ رہی۔ لیکن جب امتحان کے بعد رانو کے یہاں جانے والا دن پہنچا تو اسے بڑی بے چینی سی محسوس ہونے لگی۔ جیسے اس کی زندگی میں ایک گہرا خلا پیدا ہونے والا تھا۔ اس کا جی بار بار چاہ رہا تھا کہ اس شام کو بھی رانو کے پاس

جائے لیکن اُس نے اپنی طبیعت پر قابو پانے کی کوشش کی اور سنیما جانے کے ارادہ سے گھر سے نکلا۔ مگر وہ غیر ارادی طور پر رانو کے مکان میں داخل ہو گیا جیسے اس کے پاؤں بہک گئے ہوں یا ان پر کسی دوسرے کا قبضہ ہو گیا ہو۔

رانو اُسے دیکھ کر بہت خوش معلوم ہوئی۔ اسے اس احساس سے بڑی لذت ملی۔ "میں آج آپ کی راہ ہی دیکھ رہی تھی" رانو نے اس کے چہرہ پر اچٹتی نگاہ ڈال کر پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ اب تو تمہیں میری کوئی ضرورت نہیں" اس نے تنک کے لہجے میں کہا جیسے وہ رانو کی زبان سے اپنے بیان کو رد کرانے کا آرزومند ہو۔ "آج تو میں تم سے رسمی طور پر رخصت ہونے آگیا ہوں" اس کی نگاہیں زمین کو تکنے لگیں اور اس کے اعضا بے حرکت سے ہو گئے، جیسے کوئی دل شکستہ بے روزگار ملازمت کے فیصلہ کا منتظر ہو۔

"کیا کہیں باہر جا رہے ہیں؟" رانو کے چہرے پہ معصومیت اور شرارت کی آمیزش سے ایک دلکش رنگ پیدا ہو گیا۔ "نہیں۔ یعنی اب تم سے ملنے کی مجھے کوئی وجہ تو ہے نہیں۔ اب تو ہماری ملاقات کا سلسلہ بند ہو جانا ہی چاہیئے۔" "واہ۔ آپ میرے ہمسایہ ہیں اور کر ہم سے ملاقات بند کیوں کرنے لگے۔ میرا امتحان ختم ہو گیا تو آپ کے آنے جانے میں کوئی ہرج تھوڑا ہی ہے۔"

"نہیں۔ ہرج تو کچھ نہیں" اس کے چہرہ کی ویرانی شگفتگی سے بدل گئی۔

"تو پھر! آخر میں بھی تو امتحان کے بعد سے بے شغل ہو گئی ہوں۔ گھر میں کچھ زیادہ کام دھندا میرے لئے رہتا نہیں ہے اور یوں بھی میں گھر کے کام سے اُکتاتی ہوں۔ ترکاریاں بناؤ۔ چھالیاں کترو۔ نوکرانیوں سے لڑائیاں کرو۔ ان کاموں میں میرا جی کیونکر لگ سکتا ہے"۔ اس کی آنکھیں شرما کر جھک گئیں اور چہرے پر حجاب نے ایک ریشمی نقاب ڈال دیا۔ "آپ آتے رہیں گے تو آپ سے باتیں کر کے طبیعت بہل جائے گی۔ آئیے گا نا!" رانو نے التجا اور تحکم کی ملی جلی کیفیت سے سوال کیا۔ گویا خاطر خواہ جواب حاصل کرنے پر اسے ایک گونہ قدرت تھی۔

"آؤں گا" اس کے منہ سے یکبارگی نکل گیا۔ "ویسے تو میں بھی گویا بے شغل ہی ہوں" اس کے چہرہ پر تمتماہٹ اور بالیدگی سی پیدا ہو کر رفتہ رفتہ مٹ گئی، وہ کچھ اور کہنے کی جرأت نہ کر سکا۔

وہ تقریباً ہر ہفتہ رانو کے یہاں جاتا رہا۔ کبھی خود سے اور کبھی رانو کے بلانے پر۔ آج کل رانو کے پاس اس کا جی پڑھائی کے دنوں سے زیادہ لگتا تھا۔ رانو بڑی باتونی تھی۔ پرانے گھریلو قصے، خاندانی جھگڑوں کی داستانیں، اپنے والدین کی زندگی، ان کے آپس کے تعلقات، رانو کی گفتگو کا بیشتر حصہ ہوا کرتے۔ وہ رانو کی باتیں غایت دلچسپی سے سنتا، جیسے وہ فرائڈ کی کسی نئی کتاب کا مطالعہ کر رہا ہو اور رہ رہ کر ہلکی ہلکی مسکراہٹ کے ذریعہ ان میں ترتیب اور سجاوٹ سی پیدا کرتا جاتا۔ رانو بھی ایک ریشمی مسکراہٹ کے نقاب سے اس کی طرف دیکھ لیتی، اور زیادہ گرمجوشی کے ساتھ گفتگو

کرنے لگتی۔ کبھی کبھی اس کی مسکراہٹ رانو کی گفتگو میں ایک جادو بھری ہنسی کا قہقہہ پیدا کر دیتی۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے تیلیوں کے اشارہ سے مغربی ساز میں کسی خاص گیت کی روح ڈالی جا رہی ہو۔

وہ رفتہ رفتہ رانو سے بے تکلف بنتا جا رہا تھا۔ ابھی باتوں کے پردہ میں کبھی کبھی پیار اور محبت کے جملے بھی ہو جاتے' کچھ رومانی اشارے کنارے "امتحان کی محنت نے تمہاری صحت بگاڑ دی تھی۔ اب تمہارا چہرہ دن بدن نکھرا جا رہا ہے۔ تم آج کل کتنی اچھی لگتی ہو۔ امتحان کی فکر نے تمہیں لاغر بنا دیا تھا۔ کچھ دنوں میں تمہارا بیاہ ہو جائے گا۔ اس کے بعد تو مجھے بالکل بھول جاؤ گی۔ اسی خیال سے تو میں ابھی سے تم سے کنارہ کش ہو جانا چاہتا ہوں اور زیادہ تعلقات بڑھ جائینگے تو دکھ بھی ویسا ہی ہوگا۔" "میں کیوں آپ کو بھولنے لگی؟ آپ البتہ مجھے دھیان سے نکال دیں گے۔ مسز آجائیں گی تو پھر میں بھولے سے بھی یاد نہ آؤں گی۔" رانو ٹھنڈی سانس لے کر کہتی لجائی لجائی نگاہوں کے ساتھ۔

"تم اپنی ایک تصویر مجھے دو گی؟ کون جانے پھر تمہاری صورت بھی دیکھ سکوں!" وہ لمبی سانس لے کر کہتا۔ "تصویر سے یاد تو قائم رہے گی۔"

"یہ سول میرج کیا ہے؟" ایک دن رانو نے اس سے شرماتے ہوئے سوال کیا۔ اس کی آنکھوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ سول میرج کے مفہوم سے واقف تھی۔

"دو مختلف مذہب والوں کے درمیان شادی"

"جیسے" رانو نے بناوٹی نادانی سے سوال کیا۔

"جیسے کسی ہندو مرد اور مسلمان عورت کی شادی"۔ "اور اگر مسلمان مرد اور ہندو عورت کی شادی ہو تو اسے سول میرج نہ کہا جائے گا!" "کیوں نہیں"۔

"او۔ ابھی سے مسٹر آصف علی کے بارے میں سنتے ہیں کہ انہوں نے سول میرج کیا ہے" ان کی بیوی بھی تو ہندو ہیں نا۔ بڑے بھاری لیڈر ہیں نا وہ۔ اور ہمایوں کبیر صاحب جو کلکتہ یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں' انہوں نے بھی تو سول میرج کیا ہے سنتے ہیں بڑے قابل آدمی ہیں۔ وہ بھی شاید فلسفہ ......"

"ہاں" اس نے بات کاٹ کر کہا۔ وہ کہہ رہا تھا جیسے وہ خود ہمایوں کبیر ہو۔ اس کے چہرہ کی بالیدگی اور سینہ کا ہلکا تناؤ اسے ظاہر کر رہا تھا۔

"معلوم ہوتا ہے سول میرج اب ہندوستان میں بہت عام ہوتا جا رہا ہے۔"

"نہیں تو ابھی بہت کم ہوتا ہے"!

اس رات وہ گھر لوٹا تو سول میرج کا خیال اس کے دماغ میں برابر چکر کاٹتا رہا۔ "شاید رانو مجھ سے سول میرج کرنے کو تیار ہے"! اس کے چہرہ پر چمک پیدا ہو گئی۔ وہ پہلے ہی سے رانو کی گفتگو میں پریم کا رس محسوس کر چکا تھا اسے اب کامل یقین تھا کہ رانو اس سے انتہا محبت کرنے لگی تھی۔ وہ اس کی خاطر ہر مشکل جھیلنے کو تیار تھی۔ خود اس کا دل بھی تو رانو کے لئے بیتاب رہتا تھا۔ اس کی زندگی کا خلا تو رانو کے وجود سے ہی پر ہوا تھا۔ اس کی کمہلتی ہوئی ساحل ناآشنا زندگی رانو کی ہی بدولت تو بہتر ہوئی تھی۔۔ "سول میرج! کتنی انوکھی ترکیب ہے۔ شادی کا کتنا اچھوتا اور غیر عامیانہ طریقہ" ہمایوں کبیر کا جوڑ

اس وقت اُسے ہندوستان کے لئے مایۂ ناز معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی شخصیت اسے کانٹ اور ہیگل سے کہیں زیادہ ممتاز نظر آ رہی تھی۔ "ایک آزاد اور بلند شخصیت والا ہی تو 'سول بیرج' کر سکتا ہے" اس نے جھٹکے سے سر اوپر اٹھاتے ہوئے سوچا۔

رانو اس کی تخیئل کی دُنیا، اس کی بن سکتی تھی۔ وہ اس خیال کی لذّت سے نشہ محسوس کر رہا تھا۔

وہ ایک ہفتہ سے رانو کے گھر نہ جا سکا تھا۔ وہ عرصہ سے اپنے دوستوں کو بھلائے ہوئے تھا، ان کے یہاں آمد و رفت کا سلسلہ بالکل بند کر کے، اس کے بچپن کے ساتھی! ان کی صحبت میں اُس نے زندگی کے کتنے سنہرے لمحے گذارے تھے۔ زمانۂ تعلیم کے سارے واقعات ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے آ رہے تھے۔ ماضی کے شاہکار تھے۔ اس وقت وہ زندگی کی ہر فکر سے آزاد تھا۔ دنیا کے ہر دُکھ درد سے بے نیاز۔ اس کے دوست اس کے لئے سب کچھ تھے، وہ ان سے دل کھول کر ملتا تھا۔ ہر رسمی بندش اور رواجی تکلّف سے بے پروا۔ انہیں بھلا کر وہ ایک بڑی حق تلفی کا مرتکب ہوا تھا، ایک ناقابلِ تلافی گناہ۔ وہ افعال کی چبھن محسوس کرنے لگا۔ اس کی تمام دوستوں کے یہاں جانے میں گذرنے لگی۔ ان سے ملنے ملانے میں۔

وہ کچھ دنوں سے رانو کے یہاں نہ جا سکا تھا۔ وہ ہر روز جانے کو سوچتا، لیکن کوئی نہ کوئی مصروفیت اسے روک دیتی۔ اسی طرح دو ہفتے گذر گئے۔ یہ ایک غیر معمولی مدّت تھی، لیکن اس کے بعد بھی وہ نہ جا سکا۔

ایک شام کو رانو نے اسے بلوا بھی بھیجا اور اس نے جانے کا وعدہ بھی کر لیا لیکن پھر بھی وہ جا نہ سکا۔

اسی طرح دن گزرتے جا رہے تھے اور اُسے رانو سے ملنے کا موقع نہ حاصل ہو سکا تھا۔ اب ہر دوسرے تیسرے رانو اُسے بلوا بھیجتی۔ وہ ہر بار وعدہ بھی کر لیتا، لیکن کوئی نہ کوئی مجبوری حائل ہو جاتی۔

رانو بڑی منت سماجت سے اُسے بلواتی۔ پردہ پردہ میں اپنی بےچینی کا اظہار کرتی۔ لیکن پھر بھی وہ نہ جا سکا تھا۔ یہاں تک کہ اسے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ رانو اس سے نہ آنے کا سبب پوچھے گی تو وہ کیا جواب دے سکے گا۔ یہ احساس بھی اب اسے جانے سے روکنے لگا۔

اس طرف پھر اسے کتابوں سے زیادہ لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ لائبریری سے وہ نفسیات کی چند نئی کتابیں لے آیا تھا، اور صبح و شام ان کے مطالعہ میں مصروف ہو رہا تھا۔

وہ سرِ شام سے بیٹھا رات گئے دیر تک کتاب پڑھنے میں مصروف تھا کہ بغل کے کمرہ میں کلاک نے بارہ کے گھنٹے بجائے۔ اس کے خیالات منتشر ہو گئے اور اس کی نظر کتاب سے اٹھ گئی۔ سامنے دروازے پر رانو کھڑی تھی، اسے سخت اچنبھا ہو رہا تھا۔ "رانو یہاں کیسے ہو سکتی ہے؟" اسے خیال ہوا کہ شاید کتاب دیکھتے دیکھتے اُسے نیند آ گئی تھی اور وہ خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ مبہوت سا بیٹھا رانو کی طرف تک رہا تھا۔ رانو آہستہ قدموں سے کمرہ میں داخل ہوئی اور اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے

چہرہ سے وحشت اور پریشانی برس رہی تھی، جیسے وہ خون کر کے آئی ہو۔

"تم اس وقت یہاں کس طرح آ گئیں؟" اس نے ابرو پر شکنیں پیدا کرتے ہوئے سوال کیا۔ رانو بت بنی کھڑی رہی۔

"یہاں تمہیں کوئی دیکھ لے تب؟"

رانو کے لب نہ ہل سکے۔ جیسے الفاظ اس کی حلق میں پھنس کر رہ گئے تھے۔

"بولو نا! تم یہاں کس لئے آئی ہو، اتنی رات گئے؟" اس نے تحکمانہ انداز میں سوال کیا۔

"آپ سے معافی مانگنے۔ آپ جو مجھ سے خفا ہو گئے ہیں" رانو کی آنکھوں سے آنسوؤں کے تار بندھ گئے۔

"میں! تم سے! بے سبب خفگی؟"

"آپ ضرور مجھ سے رنج ہیں۔ تب ہی تو آپ نے مجھ سے ملاقات ترک کر دی ہے"

"نہیں! تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے اور اس غلط فہمی میں تم وہ کر گذریں جو نہیں نہ چاہیئے تھا۔ اس وقت لوٹ جاؤ۔ میں تم سے ملنے کی کوشش کروں گا"

"میں لوٹ جانے کو نہیں آئی ہوں"

"تو پھر"

"آپ سب کچھ جانتے ہیں، آپ ہی نے تو مجھے سب کچھ بتایا

ہے" اس کی آواز بھٹنے لگی ۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں"۔

"نہیں آپ سب کچھ سمجھ رہے ہیں" رانو نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ اُسے دیکھ کر ڈر گیا ۔

"جاؤ" ورنہ میں شور کروں گا" جاؤ! جاؤ!!"

"کمینے"

رانو چلی گئی ۔ "کمینے" اس کے دماغ میں دیر تک گونجتا رہا جیسے کائنات کا ذرہ ذرہ اُسے پکار کر کہہ رہا ہو "کمینے"!

سیّد اختر احمد اختر اورینوی

پیدائش کاکو، گیا۔ ۱۹۱۰ء
تعلیم ایم۔ اے (اُردو)

دراز قد، مکانوں کے در کی لمبائی سے کچھ ہی کم ـــــ یہ الحمرا یا گانگو کے تصور نہ کیے جائیں ـــــ اور اسی کے مناسب دوسرے اعضاء ـ خدو خال نمایاں اور واضح ـ کشادہ جبیں، ہنس مکھ اور شکیل صورت ـ محور دائرہ اختر، بزم ادب اور حلقہ صحبت کالج کی نمایاں ترین ہستی، نہ صرف ہیئتی لحاظ سے بلکہ مطابق مواد بھی ـ طلبا کے محبوب ترین استاد ـ باخلوص و بافیض، باعزم و باعمل اور باوقار ـ مجلس، مشاعرہ، جلسہ، میلاد میں خوب شریک کیے جاتے ہیں اور اپنی بصیرت افروز پر مغز اور سحر آگیں تقریر و خطبہ سے صحبت کو لذیذ حد تک پر کیف بنا دیتے ہیں ـ اگر کوئی صاحب، جو ان کے فیض سے محروم رہے ہیں، اختتام جلسہ یا ختم خطبہ پر بے ساختہ فرط طرب یا نمود سخن فہمی سے بھری پری مجلس میں بغل گیر ہو جاتے ہیں، اور چلتے وقت اپنے دولتکدہ پہ دوسری شام کی چائے کے لیے انہیں دعوت بھی دے جاتے ہیں ـ اختر بخوشی اقرار کر لیتے ہیں اور دوسری شام کو بہ اطمینان اور بے فکر اپنے خانہ باغ میں چلتی کیلوں کی دیکھ بھال میں مصروف رہتے ہیں ـ ایک بار دریافت کیا ـ کہنے لگے "اسے میری بات اچھی لگی اور اس نے مجھے خوش کر دیا"۔ اور یہ کہتے وقت چہرے پر ایسی کیفیت تھی، جیسے داعی و مطلوب ایک

دوسرے کو اچھی طرح پہچان رہے ہیں۔ پھر فرمایا "بھائی! کلاس دیکھ کر
سبھوں کو پیاس لگتی ہے، جس میں گہرائی نہیں تو پھر یہ بے حسی ہے"۔۔۔۔
لینے والا واقعی آتا ہے تو اختر واقعی جاتے ہیں۔ "بزم ادب" کی سالانہ
تقریب تھی، حفیظ، عندلیب، جگر، جوش سبھوں کو دعوت نامے بھیجے
گئے تھے، رقعہ اختر نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھا تھا۔ جواب آیا اور
انتخاب صدارت کا ہوا۔ جن کے جواب میں "پیشگی" کا لفظ نہ تھا۔
حفیظ جالندھری کو اختر خود ۱۲ بجے شب کو سکنڈ کلاس میں بیٹھا کر واپس
ہوئے۔

گفتگو بڑی نفیس و جمیل کرتے ہیں۔ اظہار خیال پر حیرتناک قدرت
ہے۔ باتیں صاف، لہجہ میٹھا اور انداز دلگیر بلکہ ظرافت گیر ہوتا ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ ان کے احباب اکثر اپنی نماز یا سینما وغیرہ چھوٹ جانے کی انبساط پرور
حسرت کے ہمراہ انہیں اور ان کی صحبت کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ طلباء خود
شاکی رہتے ہیں کہ اختر صاحب کے گھنٹے بہت کم ہوتے ہیں۔ خوف ہے سررشتہ
تعلیم کو اگر اس کی خبر مل جائے تو کالج کے شعبہ اردو میں مزید اردو لکچرر کے
تقرر کی تجویز فوراً معطل کردی جائے۔

شاگردوں کا بڑا خیال کرتے ہیں۔ "ہونہار" منچلوں کے لیے ان کا
خلوص اذیت بخش ہوتا ہے۔ یہ ان کے فیضہائے گراں بہا سے تقریباً سیر
اور مستفید ہو جاتے ہیں۔ یہی افراد آگے چل کر کائنات ادب میں زندہ متحرک
اور تاباں نوابغ اختر ثابت ہوتے ہیں۔

طلبا پر اختری کی شخصیت کے عناصر بہت تیزی سے اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ ہر متعلم قریب پر اس کا اثر فوراً آجاتا ہے۔ قریب تر پر اس کا پر تو دیر میں نظر آتا ہے، اور متعلم قریب تر پر اس کا جلوہ تکمیل تعلیم کے بعد نمایاں ہوتا ہے۔ اوّل الذکر پر دور اختریت کالج ہی تک استوار رہتا ہے، اور آخر الذکر پر تقریباً ابدی۔ کہتے ہیں، کالج کیفے میں چند طلبا ایک دوسرے کی شخصیت کے جلوہ نما عناصر پر تنقیص و تعریض کر رہے تھے۔ جاویدی کی شتر بے مہار چال بھی معرض بحث میں آئی پیشکش ہوئی، اعتراض ہوا اور تشریح ہوئی۔ جاویدی نے فوراً سنجیدہ جواب دیا "آپ لوگوں نے پروفیسر اورینوی کی چال کا جائزہ لیا ہے۔ میری چال آج سے ملتی جلتی ہے"۔ وضاحت یوں ہوئی "آہستہ آہستہ بھرپور قدم اٹھتے ہیں اور گرتے ہیں۔ پھر تین چار قدم چلنے پر پیروں کی حرکت سمٹ سی اور اورینوی کے جسم کے درمیانی حصہ میں خفیف سا خم نمودار ہو جاتا ہے ...... یہی اس کی بوٹی ہے اور گریس ......" ایک ستم ظریف نے اس فنکارانہ وضاحت کی فوراً پھبتی اڑادی، "جناب کی چال میں اورینوی جیسا وہ خم کہاں، آپ کے یہاں تو یہ لنگ معلوم ہوتا ہے"۔

کالج کے لڑکے مشتاقانہ "اختریت" اختیار کرتے رہتے ہیں۔ چال میں گفتگو میں، انداز میں، لباس میں، تحریر میں۔ اور تو اور سر کے دھوتی، کرتا پہننے والے برادران وطن بھی جاڑا آتے ہی سیاہ گہرے رنگ کی شیروانی اور سفید پتلون میں ملبوس کالج کے کوریڈور میں اختری نمائش سے گذرا کرتے

ہیں۔ ان کے شعر کا مترنم آہنگ اور قدموں کی بھرپور چاپ سُن کر کوریڈور سے گزرنے والی دوشیزائیں جلدی سے ایک کنارے ہوتی ہوئی دبکی سی رک جاتی ہیں اور آہستہ سے پیچھے مُڑ کر دیکھتے ہی عدم اختر پر دل ہی دل میں مسکرانے لگتی ہیں۔ پری پیکر کا یہ برق پاش تبسم طلباء کے لئے تسخیر بخش جانفزا ہوتا ہے اور تبسم تیز تر دنیز تر ہو جاتا ہے۔ اختر کی بلند ترین شخصیت سے لڑکیاں بھی واقف ہیں۔ اُردو کے اس جلیل القدر ادیب سے ہم کلامی میں انہیں بڑی جھجک، لجا اور شرم محسوس ہوتی ہے۔ کون جانے نگاہ انتخاب کس پر جا رکے اور بازار ادب میں اُردو کی رسوائی ہو ـــــ!!

مجھے اختر اپنا زیر تکمیل ناول "تعمیر" سُنا رہے تھے۔ کرشن چندر کے فن نے جنت نظر کشمیر کا سارا حسن، ساری رعنائی، ساری رنگینی، سارا کیف "شکست" میں سمیٹ لیا ہے۔ اختر نے بہار کے سرسبز جمیل و دل فریب خطہ ناگپور کو "تعمیر" کا پس منظر بنایا ہے۔ رتین پرکاش حیات میں شکست کھا جاتا ہے لیکن اختر کا ہیرو پرعزم عمل سے ایک حیات نو کی تعمیر کر لیتا ہے .... اور رکشا پر رستے بھر میں سوچتا رہا کہ تالستائے اور دوستوی میں مماثلت کتنی ہے اور کیوں؟

"میرے دماغ و دل اور شخصیت کی تعمیر میں چند چیزوں نے بہت حصہ لیا ہے۔ احمدیت (سلسلہ احمدیہ اسلامیہ)

اقبال کی شاعری، نیاز کی فسانہ نگاری، سائنس کا مطالعہ
گھر کی فضا اشتراکیت کا تفصیلی مطالعہ اور میری مسلسل
علالت ......"

اختر خود گویا ہیں اور بلاشبہ مطالعہ کا حسن، مشاہدہ کا خلوص اور فطری طباعی نے اختر کی شخصیت میں ایک بلند روش اور شادماں عزم کی تخلیق کی ہے۔ یہ زندگی کا ایک خاص تصور رکھتے ہیں۔ مذہب ان کے نزدیک حیات بخش روحانی ہے اور ادب ارتقا کا آئینہ۔ اختر کا اپنی بیوی اور ادب اور مذہب سے وہی تعلق ہے جو ایک تازہ وارد انگریز کا اپنے کسی پالتو اور کچھ بول اور بنگلا سے ___________

آسمان ادب کا یہ اختر ایک درخشاں و تاباں ستارہ ہے، جس کی شہرت ہندوستان گیر ہے۔ یہ ایک بلند افسانہ نویس، کامیاب ناقد، اچھے ڈراما نگار اور اعلیٰ صحافت نگار ہیں۔ اردو کے ان چند فنی اور تخیلی افسانہ نویسوں میں اختر ایک ہیں۔ آل احمد سرور کہتے ہیں ــــ "اختر کے افسانے مجھے پسند آئے، اختر کا مشاہدہ تیز ہے۔ وہ خارجی اور داخلی ہر قسم کی مصوری کر سکتے ہیں۔ کردار نویسی کے گر سے بھی واقف ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں در اصل کچھ کہنا ہے، یہ بڑی بات ہے ...."

اختر کے افسانے ان کی سیرت سے رچے ان کے خلوص میں بسے اور ان کے پیام سے لبریز ہوتے ہیں۔ ان کے کامیاب ترین افسانے، مرجھائی کلیاں اور کانٹے، آخری آگ، گوارا کی اوٹ سے، انارکلی اور بھول بھلیاں، گھر کو

دلچسپی اور منظر وپس منظر ہیں ــــــ یہ کہتے ہیں :ــــ "میرے کئی شائع شدہ افسانے ایسے ہیں، جن میں خود میں بھی چھپا بیٹھا ہوں اور میرے دوستوں کے نزدیک میں نے ان افسانوں میں خود اپنی رسوائی کی ہے۔ مجھے جاننا ہو تو ان افسانوں کو پڑھئے ...." اور اس کوشش میں ذیل کی کتابیں آپ کی مدد کریں گی ــــ

(۱) منظر وپس منظر' افسانہ (۲) کلیاں اور کانٹے' افسانہ (۳) انارکلی اور پھول بھلیاں' افسانہ (۴) سمنٹ اور ڈائنامیٹ' افسانہ۔ (۵) شہنشاہ حبشہ' ڈراما (۶) اقبال' تنقید (۷) کسوٹی' تنقید (۸) تنقید جدید' تنقید (۹) گزارشات' علمی و ادبی مقالے ــــ

ہم ہوئے، تم ہوئے کہ میر ہوئے

وندھیاچل اور ستپوڑا پہاڑوں کے سلسلے پورب کی طرف پھیلے ہوئے بہار کے دکھنی علاقوں تک چلے آئے ہیں۔ ہزاری باغ، رانچی، کوڈرما اور ڈالٹین گنج کا پہاڑی خطہ ہرے بھرے جنگلوں، شاندار اونچے نیچے پربتوں، بل کھاتی سوئی سی ندیوں اور پھیلے ہوئے شاداب میدانوں سے سجا ہوا ہے۔ دل والوں کے لئے راج گدی چھوڑ کر ایسی جگہ بارہ برس بن باس لینا آسان ہے، اور اگر اس بن باس کے لطف کے ساتھ راج گدی کے بھی مزے ہوں تو آپ کیا کہیں گے۔ بھگوان کی دیا سے میں اس چھوٹا ناگپور کے جنگل میں منگل منا رہا تھا۔ میرے چچا سیٹھ روکڑ مل کلکتے کے لکھپتیوں میں سے تھے۔ وہاں ان کی کئی دکانیں، کوٹھیں اور کئی ملوں میں ان کے حصے تھے۔ میرے بابو جی سیٹھ لکھا مل

میرے بچپن ہی میں سورگ باش ہو چکے تھے۔ اور چچا کو اب تک کوئی اولاد نہیں
ہوئی تھی۔ میں ہی چچا کا پوسیہ پتر تھا۔ میرے پتا جی کا کاروبار آگرہ، میرٹھ
اور کانپور میں تھا۔ مجھ سے دو بڑے بھائی اُن جگہوں کی بیوپار کی دیکھ بھال
کیا کرتے تھے۔ میں نے دلّی میں تعلیم حاصل کی۔ میرے خاندان کے لیے یہ انوکھی
بات تھی۔ گھر میں لاڈلا تھا، مجھے بی۔اے تک تعلیم دلوائی گئی۔

بی۔اے کے بعد میں چچا کی مدد کرنے کوڈرما چلا آیا۔ چچا نے حال ہی میں
چھوٹا ناگپور کے جنگلوں میں لاہ اور ابرک کے ٹھیکے لیے تھے۔ کوڈرما سے
قریب ہی پہاڑی بہت بڑی ابرک کی کانیں تھیں۔ اور وہیں پر ورکشاپ
اور گودام۔ میرے چچا سیٹھ ردکرمل نے کئی پہاڑیوں میں کھدائی کا
کام شروع کر دیا تھا۔ انہیں میں دولت چھپی رکھی تھی۔ ہمارے مزدوروں
نے چوہوں کی طرح ان پہاڑیوں میں کانیں کھود ڈالی تھیں۔ ان کے
اندر سے ابرک کی چمکتی ہوئی سلیں نکلتیں۔ کھاجوں کی طرح تہہ بہ تہہ۔
سرسبز پہاڑیوں کے دامن میں مزدوروں، کارندوں اور بابوؤں کی
خاصی نو آبادی بس گئی۔ چچا نے وہاں سے کچھ دور ہٹ کر دامودر ندی
کے کنارے ایک بلند ٹیلے پر اپنی کوٹھی بنوائی تھی۔ نئی وضع کی خوبصورت
کوٹھی اس حلقے میں نگ کی مثال جڑی ہوئی دکھائی دیتی۔ ناگن کی طرح
بل کھاتی ہوئی سڑک کوٹھی سے نکل کر سب کانوں تک جاتی تھی۔ ان
سڑکوں پر سرخ مورم کے سنگ ریزے بچھائے گئے تھے، ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ خون کی رگیں قلب سے نکل کر تمام جسم میں پھیل گئی ہیں۔ اور

پھر ہر حصّے سے خون کھنچ کھنچ کر قلب میں چلا آتا ہے۔ کوٹھی میں ابرک کی کانوں کی دولت کھنچی چلی آتی تھی اور یہیں سے زندگی بٹتی تھی۔ جفاکش مزدوروں نے پتھروں میں جو نمک لگا ڈالی تھی اور سیٹھ روکڑمل سفید ابرک کو سورج مکھی سونے میں تبدیل کر رہے تھے۔ ہمارا اپنا بجلی کا ڈائنمو بھی تھا۔ رات کو پتوں کے جھرمٹ میں دیوالی کی بہار ہو جاتی تھی۔ کوٹھی کے بڑے احاطے میں نارنگی، پپیتے، امرود، شریفے اور دوسرے پھلوں کا ایک وسیع باغ تھا۔ ہم لوگوں نے قلمی آم کے ساتھ بھی لگوائے۔ ہمارا نفیس ٹینس لاؤنس دور دور تک مشہور تھا۔ افسران گرانڈ ٹرنک روڈ اور رانچی روڈ پر فراٹے بھرتے ہوئے اپنی شاندار موٹروں سے ٹینس کھیلنے کے شوق میں ہماری کوٹھی تک ندیاں اور پہاڑ پار کرتے ہوئے پہنچ جاتے تھے اور سچ تو یہ ہے کہ میں کلکتے سے یہاں بلایا ہی اس لئے گیا تھا کہ افسروں اور ان کی بیویوں سے انگریزی میں باتیں کروں اور ان کی خاطر داریاں اور دعوتیں ہم لوگ ہر ہفتے سفینیا دیکھنے کا رنگے ذریعہ بھلے جایا کرتے تھے۔

سب کچھ تھا مگر پہلے پہل کلکتہ سے علیحدگی بہت کھلی۔ یوں تو کلکتے میں بھی اسے کیا دیکھا تھا۔ میں وہاں اکثر سوچا کرتا تھا کہ تفریح اور دل بہلاؤ کی اتنی ڈھنگی قسمیں اس شہر میں ہیں کہ ایک بھلے مانس کا دم گھٹ کر رہ جائے۔ کلکتے سے دل بھر چکا تھا۔ پھر بھی اس جنگل میں جمائیاں لیتے لیتے دن کاٹے کٹتے تھے۔ رفتہ رفتہ میں نے دل لگی کی سبیل نکال ہی لی۔ میری شکار کے علاوہ جوانی کی ساری رنگین تمناؤں کے پورا

ہونے کی ایسی ایسی البیلی صورتیں نکل آئیں، کہ میرا جی چاہنے لگا تھا کہ اسی جنگل میں دھونی رما کر بیٹھ جاؤں۔

اس پتھریلے جنگلستانی علاقے میں کاشتکاری زیادہ کبھی نہیں ہوتی تھی۔ یہاں اردگرد، بکھری بکھری ہوئی جو بستیاں آباد تھیں، ان میں رہنے والوں کی اکثریت نرالے رنگ کا پیشہ کیا کرتی تھی۔ کھیتی باڑی تو نام کی تھی۔ گردو نواح کی پہاڑیوں میں قدیم سادہ طریقوں سے ابرک نکالا کرتے اور کاروباری گماشتوں کے ہاتھوں بیچ دیا کرتے تھے۔ بڑے نام قیمتیں ملتی تھیں۔ گاؤں کی عورتیں بکریاں پالتیں۔ جنگلوں سے جنگل پھلاری توڑ کر لاتیں، شریفے، فالسے، کیند، پیار، ان پھلوں کو وہ دور دراز قصباتی بازاروں میں جا کر بیچتی تھیں۔ یہ عورتیں گانے اور ناچنے میں بڑی مشاق ہوتی تھیں۔ پشتا پشت سے یہی پیشہ تھا۔ صدیوں کے رقص و نغمہ کی روح ان کی حسین آنکھوں کے دریچے سے جھانکتی تھی۔ کھلی صحرائی ہوا، نیلے آسمان سے سورج اور چاند کی برستی ہوئی سنہری روپہلی کرنوں اور آزاد جنگل کی ہری بھری رُت نے ان کھیلاٹن عورتوں کے شاداب، موزوں، اُمنڈتے ہوئے جسموں کی پرورش کی تھی۔ اردگرد کے نوابزادوں، راجوں، راجواڑوں کے یہاں یہ کھلیٹن شادی بیاہ، پرب تہوار اور دوسری تقریبات میں ناچنے گانے کے لیے بلوائی جاتی تھیں۔ افسروں کے تبادلے کی دعوت یا بڑے صاحبوں کی پارٹیوں کے موقع پر تبدیلِ ذائقہ کے طور پر بھی۔ کھلیٹن ڈانس سے لطف لیا جاتا تھا۔ کھلیٹن بلا کی حسین ہوتی ہیں، کوئی گوری

دیپک کی طرح اور کوئی سانولی لشت کی شاموں کی مانند۔ ان کا ناک نقشہ اتنے کھلے طور پر اعلیٰ ذاتوں کی طرح ہوتا ہے کہ ہر شخص یہ یقین کرنے پر مجبور ہے کہ ان کی رگوں میں کئی پیڑھی اوپر سے شریفوں کا خون ملتا آیا ہے ان کے مردوں کا رنگ روپ بھی خاصہ ہوتا ہے۔ لیکن ابرک نکالنے کی وجہ سے اور مہوے کی شراب بہ کثرت پینے کے سبب جلد ہی جل جاتا ہے۔

جب سے میرے چچا نے ابرک کی پہاڑیوں کا ٹھیکہ لیا تھا، انہوں نے نئے طریقے سے بڑے پیمانے پر کان کنی شروع کی تھی۔ مشینوں نے انسانوں کی مدد کی تو مہینوں کا کام ہفتوں میں ہونے لگا۔ مکمل انتظام تھا۔ مزدور، ہیڈ، فورمین، انجینیر، موٹر ٹرک، بجلی، لفٹ، بنگلے، گودام، ہری بھری اچھوتی وادیوں کی گود میں سیاہ دھوئیں مل کھانے اور بڑے بڑے ٹرک دوڑانے لگے۔ کھلیٹی مرد جو پہلے اپنے طور پر ابرک نکالا کرتے تھے، اب چچا کی کانوں میں مزدوری کرنے لگے۔ نجی طور پر کام کرنے سے زیادہ انہیں نفع ہونے لگا۔ کھلیٹوں کے علاوہ دیس دیس کے مزدور کھاد میں کام کیا کرتے تھے۔ ان مزدوروں کو ہر ہفتہ پر اُجرت ملا کرتی تھی۔ مزدوری ابرک نکالنے کی مقدار پر منحصر ہوتی۔ صبح سویرے کوک پڑتے ہی مزدور اپنے اپنے گاؤں کی جھونپڑیوں، اور اپنے اپنے ٹنڈ سے نکل نکل پہاڑی پگڈنڈیوں پر یوں گذرتے دکھائی دیتے تھے، جیسے چیونٹیوں کی قطاریں۔ یہ مشغول کام چیونٹیاں اپنے اپنے بلوں میں داخل ہو جاتی تھیں۔ دن دن بھر اس کے اندر رہتیں۔ اپنا رزق کماتیں اور دنیا کو محبت کا سبق اور ابرک دیتیں۔

ایک دو کانوں میں لفٹ لگائی گئی تھی۔ لیکن بہت سی کانوں میں لوہے کی سیڑھیوں کے ذریعہ ہی اُترا جاتا تھا۔ بہت ہی تنگ و تاریک راستے، منزل بہ منزل، بھول بھلیوں کی طرح ہر طرف پہاڑیوں کا جگر چیرتے ہوئے پھیل گئے تھے۔ سائنس اور سرمایہ نے مل کر فطرت کے خزانوں میں بہت گہری نقبیں لگائی تھیں۔ زمین کا کلیجہ چھلنی ہو گیا تھا۔ دھرتی دولت اُگل رہی تھی۔

کھلیٹ لوگوں کی فارغ البالی وقتی ثابت ہوئی۔ آمدنی تو بڑھ گئی تھی۔ مگر رفتہ رفتہ غلے کے خرچ کی زیادتی کے سبب صنعتی نوآبادی کے حلقے میں گرانی بڑھ گئی۔ باہر سے بھی مزدور بہ کثرت آنے لگے۔ اب تک کھادہ میں کام مل جانا مشکل تو نہیں تھا، پر اُجرت روز بروز گھٹنے لگی۔ میٹ اور فورمین اپنی مٹھائیاں گرم کرنے لگے۔ گل کاٹ پچھا۔ گر آزاد ایرک نکالنے والا کھلیٹ تاجر آج کا بندھا غلام تھا۔ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ کھلیٹن عورتوں کو بھی کانوں میں کام کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ہر نیاں جھگڑوں میں جوت دی گئیں اور مور جلی پیسنے لگے۔

وہ بھی ایک کھلیٹن تھی۔ میں اُسے کبھی نہیں بھول سکتا۔ رتنا! ہاں وہ انمول رتن تھی۔ ایرک کے کانوں میں چمکنے والا ایک نایاب ہیرا۔ وہ کوڈرما کی گھاٹی میں چمکنے والا سورج تھی۔ اُس کا چہرہ کسم کے چھپے پھول کی طرح تھا، اس کی آنکھیں کہستانی جھیلوں میں کھلنے والے کنول کی کلیوں کی مانند اور اس کے ستار کے تاروں کی مثال نازک، نغمہ ریز لب جنگلی چنار کی سُرخی لیے ہوئے

تھے۔ اس کا سڈول گدرایا ہوا بدن اجنتا اور ایلورا کی دیویوں کے جلوے دکھاتا تھا۔ اس کی چال پہاڑی جھرنوں کی موسیقی تھی، اور اس کا شباب چیت کی سنکتی ہوئی پچھوائی، ساون کے برستے ہوئے بادل اور بھادوں کی اُمڈتی ہوئی ندیوں کی طرح سرمست، رسیلا اور رواں تھا۔

میں اپنے چچا کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ آج میں انہیں کی بدولت دیس دیس مارا مارا پھر رہا ہوں۔ رتنا کا خیال میری حیات ہے۔ مگر میں کتنا بے بس ہوں۔ میں اپنے سپنوں کو کیسے حقیقت بنا لوں، جب سب سے بڑی حقیقت بھی سپنا بن گئی۔

رتنا ابرک کی کانوں میں کام کیا کرتی تھی۔ مجھے جیتن میٹ نے اس کی اطلاع دی، اُسے دکھلانے کا وعدہ کیا اور دکھلا بھی دیا۔ میں نے بہت سی حسین البیلی صورتیں دیکھی تھیں، اور بہت سے سندر روپوں کی پوجا کی تھی، پر رتنا کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ اس سے پہلے میں نے جگ بھر میں کوئی سندر روپ دیکھا ہی نہیں تھا۔ میں نے اس علاقے کی کھلتوں کو بھی دیکھا تھا اور آپ جانئے محرومی و نارسائی کی خلش میرے دل میں کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں کیوں رتنا کو دیکھتے ہی میرے دل نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک دیوی ہے اور میری پرارتھنا کی پہنچ سے بہت اونچی۔ دھیرے دھیرے آتما میرے خوابوں کی دنیا اور خیالوں کی بستی میں بس گئی اور مجھ پر ایک پاک جذبہ طاری ہو گیا۔ دیوی کے درشن نے میرے من کو نرمل بنا دیا اور میری جان کو کندن۔ موہ کپٹ اور گناہوں کو جیسے کسی نے بالکل دھو کر رکھ دیا۔

جس روز مزدوروں کو ہفتہ بٹتا تھا، اس روز ساری نوآبادی میں مہوے کی شراب، چاول کا ٹھرا دیسی دارو کی بوتلیں خوب اڑتی تھیں ساری ساری رات شیڈوں میں ہنگامہ مچا رہتا تھا اور نوجوانوں کے حلقے میں کھلونوں کا ناچ ہوتا تھا۔ ایک دفعہ ایک نوجوان نے رتنا کو ناچنے کے لئے بلوایا، مگر وہ نہ گئی۔ کئی بار بلاوے آئے اور وہ انکار ہی کرتی رہی۔ شمبھو نوجوان کے لئے یہ رسوائی کب برداشت کے قابل تھی۔ اس نے رتنا کا نام لسٹ سے کاٹ دیا۔ نوجوان کے درباریوں میں سے چند نے اس کے یوں کان بھرے، کہ رتنا کا غرور اس سبب سے ہے کہ وہ اتری دیس کے فلاں مزدور پر مرتی ہے۔ یہ پردیسی مزدور بھی شمبھو بابو کی نظروں پر چڑھ گیا۔ چینی میٹ مجھ سے شوخ تھا اور وہ کوٹھی کی تعمیرات، باغبانی و چمن اندازی کے سلسلے میں مزدوروں پر نگہبان مقرر تھا۔ اس کے ذریعہ مجھے ساری خبریں مل جایا کرتی تھیں۔ میں نے رتنا کو کوٹھی کے کچی کاموں پر لگوا لیا۔ وہ بہت دنوں تک نئے ٹینس کورٹ پر سرخ موروم بچھانے اور موروم کوٹنے کا کام کرتی رہی، مگر مجھ میں اتنی ہمت بھی نہ ہوئی کہ رتنا سے دو باتیں ہی کر سکوں۔ وہ بیر اسو رہی تھی اور میں اسے آنکھیں بھر کر دیکھ نہ پاتا تھا۔ اس درمیان میں اس پردیسی مزدور کو بھی شمبھو بابو نے نکال دیا۔ ان ہی دنوں جنگلوں میں ملیریا کی سخت وبا پھیلی۔ مزدور بہ کثرت بیمار پڑنے لگے۔ پردیسی مزدور بیکاری کام سے برطرف ہوتے ہی سخت بیمار پڑا۔ نوآبادی کے ڈاکٹر نے اس کا علاج مفت کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اب وہ کھاد میں کام

کرنے والا آدمی نہ تھا۔ سچ پوچھئے تو نواری کے نکالے جانے اور اس کے
بیمار پڑ جانے سے میرے دل کے چور دروازے سے خوشی داخل ہوئی تھی۔
نواری کی حالت دن بدن ردّی ہوتی گئی۔ کیا بتاؤں رتنا کتنی اداس
اور بے قرار رہنے لگی۔ اس نے اپنی ساری مزدوری کی اجرت نواری کے
علاج معالجے میں صرف کر دی۔ نواری اپنے ایک دوست کے شیڈ
میں رہتا تھا۔ شام کو رتنا سیدھی وہاں جاتی اور رات بھر اس کی
تیمار داری کیا کرتی تھی۔ رتنا کی جسّت بھی حسین تھی۔ اس نے نواری کے
لئے اپنے پرایوں کے طعنے سنے اور ان کے انتقام کا نشانہ بنی۔ میں آپ
سے سچ کہتا ہوں، میں رتنا کی وفاشعاری سے اتنا متاثر ہوا کہ ایک دن
میں نے اُسے بلا کر ہمّت کرکے یہ کہہ دیا۔ "رتنا نواری اچھا ہو جائے
تو میں اُسے کام پر لگوا دوں گا"۔ رتنا بجھی ہوئی شمع کی طرح پگھل پڑی
انمول موتی اس کی غمگین آنکھوں سے برس رہے تھے۔ میں نے اپنے
دل میں سخت دکھ محسوس کیا۔ مجھے پھر نواری سے نفرت سی ہونے لگی۔
میرے چچا کی ساری دولت پر نواری حقارت کی ہنسی ہنستا ہوا دکھائی دے رہا
تھا۔ ایک جلن سی پیدا ہوئی، کاش نواری اچھا نہ ہو۔ لیکن جب وہ اچھا ہو
ہی گیا تو میں نے رتنا کی خاطر، یا شاید اپنی ہی خاطر کہ رتنا کی نگاہوں میں
سُبک نہ ہو جاؤں۔ نواری کو کان میں کام دلوا کر مزدوروں کا میٹ
بنوا دیا۔ رتنا چچا کی کوٹھی پر باغ میں کام کرتی رہی۔ ایک روز اس نے
بڑے ناز سے مسکرا کر اور کچھ شرماتے ہوئے کہا۔ "سرکار کی ہم پر کتنی دیا ہے"

اس کی نشیلی آنکھوں میں حسن کی تاثیر کا نازاں احساس جھلک رہا تھا۔ مجھے ساری دنیا کی بادشاہت مل گئی۔

کیا عرض کروں، میری زندگی کی بڑی تکلیف وہ گھڑی وہ تھی، جب جیتن سیٹھ نے مجھے اطلاع دی کہ بڑے سرکار یعنی چچا روگڑمل رتنا کی تاک میں ہیں۔ میرے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ مجھے یقین نہ آتا، مگر جب دوسرے روز خود رتنا مجھ سے روتے ہوئے کچھ ایسی باتیں کہیں کہ میرے ہوش اُڑ گئے۔ ادھر شمبھو نورمین نے ریشہ دوانیاں شروع کیں۔ وہ مینیجر صاحب کی منڈلی کا ایک فرد تھا۔ اس نے چچا تک میری شکایتیں پہنچائیں۔ ادھر کچھ دنوں سے چچاجی مجھ سے برہم برہم سے تھے۔ آخر ایک روز انہوں نے میرے کلکتہ چلے جانے کا حکم صادر فرمایا۔ کہنے لگے امریکہ کے انٹرنیشنل مارکٹ پہ قبضہ کرنے کی ضرورت ہے۔ امریکن اور جاپانی ایجنٹوں سے جاکر ملو اور ہیڈ آفس کا چارج لے لو۔ میں نے کتنی بڑی غلطی کی۔ چچا کی دولت مجھے رتنا سے زیادہ پیاری ہو گئی۔ میں کلکتہ چلا گیا اور اب میں اسی دولت پہ لات مار کر شہر شہر کی خاک چھان رہا ہوں۔ میں چچا کا منہ تک دیکھنا نہیں چاہتا۔ جب میں کام سے واپس آیا تو کوڈرما کی نوآبادی بھر میں یہ خبر کانوں کان مشہور تھی، کہ سیٹھ روگڑمل نے خود بنواری کو مروا دیا۔

نورمین شمبھو اس کھاد کا معائنہ کرنے گیا، جس میں بنواری کام کرتا تھا۔ شام کے وقت سب سے آخری شفٹ میں شمبھو نے دو گنڈوں کے

ساتھ لفٹ پر نواری کو اس غرض کے لئے کان کے اندر بھیجا کہ وہ رپورٹ کرے نئی بورنگ پر کام کرنے کے لئے ٹھیک کتنے مزدور کی ضرورت ہوگی۔ کسی طرح دھوکے یا زور زبردستی سے نواری کو کان کے اندر ہی چھوڑ کر لفٹ کا بٹن دبا دیا گیا۔ لفٹ اوپر آگیا، اور نواری زندہ درگور ہو کر رہ گیا۔ کئی گھنٹوں کے بعد نقلی طور پر خطرے کا سائرن بجایا گیا اور نواری کی کھوج شروع ہوئی۔ رات کو نواری کی لاش، دم گھٹ جانے سے نیلی پڑی ہوئی ملی۔ دوسرے روز دامو، رنڈی اس کی راکھ بہا کر لے گئی۔ اس واقعہ سے ایک ماہ بعد رتنا سیٹھ رو کرمل کی کوٹھی سے پاگلوں کی طرح ہذیان بکتی ہوئی تقریباً عریاں نکلی اور دوڑتی ہوئی جاکر ایک گہری کھاد میں کود پڑی۔

مجیب الرحمٰن سہیل عظیم آبادی

پیدائش پٹنہ، ۱۹۱۱ء

چراغ اونچا کرنے کی ضرورت نہیں، آپ انہیں جانتے اور پہچانتے ہیں،
یہ ہیں سہیل عظیم آبادی ——
صندلی رنگ، پیشانی چوڑی، بھویں سیاہ اور تقریباً ملتی ہوئی قد...
...... پر ذرا ٹھہرئیے، ایک سوال .... "مزاح کی کیا تعریف ہے"
"A SENSE OF INCONGRUITY IS THE SOURCE OF LAUGHTER
"جی نہیں؛ اردو میں اور مثال کے ساتھ کہئے"
"حالات کی نامطابقت یا ناموافقت جو ......"
"نہیں صاحب دو لفظوں میں سیدھی سی تعریف —— لامتناسب
اشیاء کی یکجائی، جیسے ...... بھرے مجمع میں نماز عید کے بعد آخر" اور رینوی
اور سہیل عظیم آبادی لپٹ کر گلے مل رہے ہوں ......"

مراد پور میں برف والی دوکان کے پاس سڑک کے کنارے چھوٹی سی بھیڑ
لگی تھی۔ لوگوں کا نصف دائرہ جیسی شکل کا یہ مجمع آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا تھا
بھیڑ میں پھر چھپے لوگ نظر آ رہے تھے، اور سبھوں کی نگاہیں بیچ مجمع میں کسی فرد
پر تھیں۔ آگے بڑھا کہ دیکھوں کیا واقعہ ہے۔ مجمع سے آوازیں آ رہی تھیں ——

"ایک دم بے بنیاد، مبارک باد، فرصت کہاں، ہاں ضرور، نہیں پیارے یہ کبھی ممکن ہے، ملتا ہی نہیں، بدلنا پڑے گا کیوں نہیں، خوب چیز تھی، آسان نہیں ہے، اللہ کی قسم دبا تھا، آداب بھائی، بیرنگ ہی بھیج ـــــــ"

باتیں عجیب اٹل بے جوڑ سی تھیں، واقعہ سمجھ میں نہ آیا اور میں قریب چلا آیا۔ مجمع سے لگ کر شانوں کی جھجری سے اندر تاکنے لگا۔ تمام باتیں ایک ہی شخص کی تھیں، اندر سہیل عظیم آبادی تھے۔

بال پریشاں، چہرہ شاداں، لب خنداں، اور خود ویراں سہیل کی یہ خارجی علامات ہیں۔ داہنے ہاتھ کی انگلیاں پاجامہ نما پتلون کی جیب میں روپوش تھیں اور حمدار بازو "لینن اور مارکس" کو سینہ سے چمٹائے تھا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیاں ڈی۔ ام۔ سی لچھے جیسے ملائم بالوں کے چھلے بنا بنا کر توڑ رہی تھیں اور بنا رہی تھیں اور بایاں بازو ایک ادھیڑ عمر کے بازو میں حمائل تھا۔ سالک کون تھا اور حامد کون؟ یہ کہنا دشوار تھا، ہاں بازوؤں کا اتصال سخت تھا اور گتھم گتھا۔ پیرے سیماب وار تھے اور سیاہ ابرو سیاہ عینک کی گولائی سے ابھرا ابھر، بلند ہو جاتے۔ مجمع کی تمام نگاہیں سہیل پر تھیں اور سہیل کی دو آنکھیں سارے مجمع پر۔ ہم کلام سب لوگ تھے، مخاطب پورا مجمع اور متوجہ صرف سہیل۔ اس لئے زبان اور پیرے پوری طرح ہم آہنگ تھے اور ہمنوا بھی۔

"کہاں بھائی؟" نگاہوں نے مجھے بھی دیکھ لیا اور آواز آئی "خدا حافظ" میں نے کہا "سلام علیکم" اور سرکتا ہوا نزدیک آگیا، پوچھا

کب تشریف لائے سہیل صاحب ؟"

" ایسوں کو میں پوچھتا بھی نہیں" جواب سنائی دیا، میں چپ ہو گیا۔ پھر آواز آئی " مارو کمبخت کو" مزید بولنا لاحاصل تھا اور بات ختم ہو گئی۔

عظیم آباد پٹنہ وطن ہے اور سکونت اردو گھر رانچی۔ پیشہ خدمت ہے اور مشغلہ (HOBBY) ادب۔ چھ ماہ سات ماہ پر گھر آتے ہیں اور آتے ہی بھاگتے ہیں۔ زیست و موت اور فنا و بقا دراصل سہیل کا یہ زندہ آنا اور بھاگنا اور آنا ہی ہے۔ جانے پہچانے اس چراغ روشن کو پاس دیکھتے ہی پروانہ وار گرتے ہیں ـــــ پر آپ کو شاید غلط فہمی ہو، سہیل میں نہ جمال ہے اور نہ ادائے محبوب۔ اقبال نے پروانے کی جان بے قرار اور شمع کی برق نگاہ پر غور کرنے ہی شمع سے پوچھا۔

سیماب وار رکھتی ہے تیری ادا اسے
آداب عشق تو نے سکھائے ہیں کیا اسے

ادا نہ سہی، پر سہیل کا وجود بلاشبہہ دوسروں کو سیماب وار بنا ہی دیتا ہے۔ خدمت ادب نے آداب عشق کی جگہ لے لی اور پیشہ و مشغلہ نے سنگھار کے ساتھ خلوص کی اوڑھنی میں سہیل کو شکیل بنا ڈالا۔ یہ حقیقت ہے کہ سہیل عظیم آبادی نے اپنی زبان کی تبلیغ و اشاعت میں نہ صرف چھوٹا ناگپور کے وسیع علاقہ میں عزم افزا کارہائے نمایاں کیے ہیں، بلکہ اپنے ادب کی تدوین و تخلیق میں انہوں نے سارے ہندوستان میں حیات بخش نمونے چھوڑے ہیں ـــــ بہار کا یہ پر نور

چراغ وطن آتے ہی دمک سا جاتا ہے۔ پٹنہ میں سہیل پر نگاہ جاتے ہی ناواقفی نگاہ ٹھہر جاتی ہے۔ سڑکوں پر چلتے اور گذرتے ہوئے رکتے ہوئے بھی سہیل کو سامنے دیکھ کر پیر لاشعوری طور پر ساکن ہو جاتے ہیں، اور آناً فاناً چار فٹ ساڑھے سات انچ کا یہ چھوٹا انسان مگر بڑا ادیب مجمع سے گھر جاتا ہے۔ باتیں شروع ہو جاتی ہیں ؛ اظہار تحسین اور اظہار اخلاص کے ساتھ ساتھ مجمع سہیل عظیم آبادی کی بصارت، سماعت اور ادراک کو بھی اظہار شکوہ و استفسار سے اذبس قریب تر و قریب تر بنا کر دیتا ہے اور جوابوں کے تانے بانے میں ہر ہمکلام چپک سا جاتا ہے۔

سہیل فطرتاً افسانہ نگار، عادتاً شاعر مزاج، رسماً مسلمان اور مذہباً سوشلسٹ ہیں، پان خوب کھاتے ہیں، بلکہ چباتے ہیں ؛ سگریٹ کے عادی اور چائے پابندی سے نوش کرتے ہیں اور کہانی جی سے لکھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود سہیل سوشلسٹ ہیں۔ کیونکہ لباس پہنتے ہیں، بلکہ معمولی استعمال کرتے ہیں۔ تھرڈ کلاس میں بلا تکلف سفر کرتے ہیں اور نہایت فیاض، احسان نواز اور محبت والے انسان ہیں۔

سہیل نے اردو افسانوں میں اپنی جگہ وہاں بنالی ہے جہاں احمد ندیم قاسمی، سدرشن اور پریم چند کی بیٹھک ہے۔ یہ فنکار ایک خاص گوشہ میں جمع ہیں اور ان کا جھنڈا پریم چند کے ہاتھوں بلند ہے۔ دیہاتی پنجاب احمد ندیم قاسمی کے یہاں سرسبز ہے، بہاری بستیاں سہیل عظیم آبادی کے یہاں شاداب ہیں اور شمالی ہند کے امن افزا گاؤں منشی پریم چند

کے یہاں بالیدہ ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کی چشم داہر وہ خوشنمائی دیکھتی ہے جو بدصورت نظر آتی ہے' اور ہر وہ بدنمائی پیش کرتی ہے جو خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ بستیوں کا امن چین، گاؤں والوں کا سُکھ دُکھ، دیہات والیوں کا سادہ پریم اور مالکان کی تیموریت، بابوؤں کی فسطائیت، سرکاروں کی شہنشاہیت ہی ان کے افسانے کا موضوع ہیں اور ان ہی کی عکاسی سہیل کی فسانہ نگاری ہے۔ سہیل کی یہ ترجمانی حیات دل پذیر اور نگاہ گیر ہے۔

ڈومزدور

چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن کے پاس ہی چینی کا ایک بڑا سا کارخانہ تھا۔

اسٹیشن اور کارخانہ کے درمیان کچی سڑک پر پھوس کی ایک جھونپڑی تھی۔ جھونپڑی کے دروازے پر ایک تختی لٹکی تھی، جس پر لکھا تھا "گرم چائے"۔ جھونپڑی کے اندر مٹی کا ایک چبوترہ تھا، میز کرسی کے بدلے تاڑ کے پتوں کی چٹائی تھی۔ چبوترے پر دو تین میلی اور آدھ ٹوٹی پیالیاں رکھی تھیں، اور دو تین میلی کچیلی دیگچیاں۔ ہوٹل کی ٹٹی والی دیوار۔ چبوترے کے علاوہ سامنے سڑک تک پر مکھیوں کی ایک عظیم الشان فوج پڑاؤ ڈالے تھی۔ سامنے سڑک پر کیچڑ سے ذرا ہٹ کر ایک مریل سا کتا بیٹھا تھا ———

مزدوروں کا ہوٹل اور کیسا ہوتا ——

گاڑی آنے میں ابھی دیر تھی۔ بوڑھا ہوٹل والا جس کی ایک آنکھ "ماتا میا" کی بھینٹ چڑھ چکی تھی۔ جلدی جلدی پانی گرم کرنے کی فکر میں تھا، کبھی وہ میلی سی دیگچی کو چولھے سے اُتار کر پنکھا جھلتا، اور کبھی دیگچی کو چولھے پر رکھ کر۔ کوئلہ کچا تھا۔ اس لئے ساری جھونپڑی دھوئیں سے بھری تھی۔ بوڑھا کبھی کبھی بیتابی کے ساتھ سڑک پر دور تک نگاہ دوڑاتا۔ پھر آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ اب تک نہیں آئی حرمجادی۔

بوڑھا تھک گیا۔ پنکھے کو الگ رکھتے ہوئے اس نے پریشانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

"اوہ! بڑھاپے میں ہی سب دُکھ لکھا تھا۔

اتنے میں ایک بوڑھی عورت ٹوکری میں کوئلہ لئے ہوئے آئی۔ بوڑھے نے اس کو غصہ بھری نظروں سے دیکھا، لیکن آہستہ آہستہ کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔ بوڑھی عورت نے تیز ہو کر کہا۔

"تمہیں تو گسّا ہی آتا رہتا ہے۔ سب کام بھلے اپنے ہی کر لو۔"

بوڑھے نے کہا۔

"ارے جمن کی ماں! تم تو بے پھول ہی بگڑ جاتی ہو۔ دیکھو نہیں سب کے آنے کا بیلا (وقت) ہو گیا۔

بوڑھی عورت منہ پھُلا کر ایک طرف چپ چاپ بیٹھ گئی۔ بوڑھے نے جلدی جلدی چولھے پر کوئلہ رکھا اور زور زور سے پنکھا جھلنے لگا۔ آنچ اچھی ہو گئی تو بوڑھا جلدی جلدی پیالیاں دھونے لگا۔ اتنے میں

کارخانے کا "بمبا" بجا، مزدوروں کو چھٹی ہو گئی۔ اور وہ سب کارخانے سے نکلے ——— جیسے رات بھر کی بند مرغیاں صبح کو ڈربہ کھلنے پر۔

بوڑھا پھر گھبرا کر اٹھا۔ پیالیوں کو چبوترے پر رکھ کر چولھے کو دیکھنے لگا۔ چولھے میں آنچ ٹھیک تھی۔ مگر اس سے اُسے تشفی نہ ہوئی۔ اُس نے کہا۔

"ارے جمن کی ماں ذرا پنکھا تو جھل"۔

بوڑھی عورت اسی طرح مُنہ لٹکائے بیٹھی رہی۔ اپنی جگہ سے ذرا بھی نہ ہٹی۔ بوڑھے کو غصّہ آگیا۔ وہ بڑبڑانے لگا۔

معلوم ہوتا ہے، جیسے ہم ہی اکیلے کھاتے ہیں۔ پگلی!! اس کو کوئی غرض ہی نہیں، آج میری آنکھ بند ہو جائے تو کل ہی پتہ چل جائے، کوئی بھیک تو دے ہی نہیں اس چال سے۔ بوڑا ہی، کہیں کی۔ جا ہم بھی ———"

اتنے میں چند مزدور ہوٹل میں آگئے۔ بوڑھے نے بکنا بالکل بند کردیا۔ فوراً آنے والوں کی طرف مخاطب ہو گیا اور لگا آپ ہی آپ بولنے۔ جیسے وہ باری باری سب کی باتوں کا جواب دے رہا ہے۔

آج تو ایسی اچھی روٹی پکی ہے کہ واہ رے واہ۔ اور بھاجی تو ایسی ہے کہ کھا کر جی خوش ہو جائے۔ اُس کو کھا کر آدمی گھنٹوں کیا ہفتوں مزا نہیں بھول سکتا۔ بیٹھو بھائی بیٹھو، سب کو دیتے ہیں۔ ذرا چولہے کا پانی ہوا ہا ہے؟

بوڑھا پھر آنے والے مزدوروں کی طرف مخاطب ہوا، اور سب سے پوچھنے لگا۔ "تمہیں کیا چاہیئے؟ تمہیں کیا چاہیئے؟"

پھر کسی کو روٹی بھاجی، کسی کو بھات دال۔ کسی کو گوشت روٹی ـــــــ جس نے جو مانگا اُسے دیا۔ اُداس جھونپڑی میں زندگی کی لہر دوڑ گئی، کچھ دیر تک چہل پہل رہی۔ پھر ایک کے بعد دوسرا اُٹھ کر چلا گیا۔ صرف تین چار مزدور رہ گئے۔ بوڑھے نے سب سے کہا۔

"بیٹھو بھائی بیٹھو! ابھی چائے دیتے ہیں"

اُس نے دیگچی میں چائے کی پتّی ڈال دی۔ پانی چولہے پر کھول رہا۔ بوڑھے نے کہنا شروع کیا۔

"آج تو وہ چائے پلائیں گے کہ بس رے بس۔ جب ہم میکلیں صاحب کے یہاں تھے بھائی۔ تو ایک صاحب آیا۔ پارٹی تھا بڑا پارٹی۔ ہاں بہت سے صاحب لوگ آئے۔ میم صاحب بھی۔ بڑا دعوت میں ہمارے پکائے کھانے کی صاحب لوگوں نے بہت تعریف کیا اور صاحب نے دس روپیہ انعام دیا ...."

ایک جوان مزدور بولا۔

"ارے بوڑھا میاں وہ جلدی چائے، تم بکتے ہو"۔

بوڑھا بولا۔

"ہاں بابو ابھی دیتے ہیں"

دوسرا مزدور، جس کی عمر چالیس سے زیادہ تھی۔ بولا۔

"ارے بلاکی! تیرا جبان بہت کھراب ہو گیا ہے"

بلاقی نے جواب دیا۔ "نہیں جمرو بھائی! بوڑھا بہت بکتا ہے"۔

بلاقی بالکل جوان تھا۔ بالکل کالا اور موٹا کٹا۔ سر میں انگریزی بال اور ٹیڑھی مانگ۔ تیل سے سر کے بال چمک رہے تھے۔ بوڑھے نے سب کو چائے بنا کر دی۔ ضمیر نے بلاقی سے کہا۔

"ارے کیا نساماں جی تیرے باپ کی عمر سے جادے ہی ہیں۔ ان کو ایسا کہتا ہے"

"نہیں جمرو بھائی یہ تو کھیل کی بات ہے۔ بڑے میاں اپنے ہی آدمی ہیں۔"

ضمیر بولا۔

"نہیں۔ تیرا جبان کھراب ہے ہی۔ اچھا کل بابو سے کاہے کو لڑ رہا تھا" بلاقی نے شکایت کے طور پہ کہا۔

"سالے نے پھر گمہا جر بنا دیا جمرو بھائی! بڑا کھچڑا ہے سالا۔"

"ارے گانی کاہے کو بکتا ہے۔ کوئی فائدہ ہو گا اس سے ــــ بابو سے لڑ کر۔"

بلاقی نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تو اس سالے کو کیا ملے گا؟ سیٹھ باپ ہے اس کا۔ اسی کو تو سارا دھن مل جائے گا؟ پانچ منٹ دیر ہوا اور سالے نے گیر حاجر کر دیا"۔

"اس بیچارے کا تو کام ہی یہی ہے۔ لڑائی بری بات ہے۔ کھوسامد برامد سے آدمی کو کام نکالنا چاہیئے بلاقی"۔

تم بھی جمر بھائی کیسی بات کرتے ہو۔ کھوسامد کاہے کی۔ بھیک تھوڑے

دیتا ہے سالا۔ اب کی ہاسی کرنے گا تو دیں گے دو چپیٹ۔"

ضمیر نے بلاقی سے چڑ کر کہا۔

"ارے پاگل مت بن، بات سمجھا کر۔"

بلاقی نے تن کر کہا۔

"ارے بھیا! جو جی میں آئے کر لو، یونین نہیں ہے یہاں، نہیں تو تین چار دن کی ہڑتال میں ہوش آجاتا سب کو۔"

ضمیر کو ذرا غصہ آگیا۔ وہ بولا۔

"بھول یونین یونین بکتا ہے۔ گریب کو وہاں بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ ابے ہم کھد یونین کے مارے چھٹے ہیں۔ دیکھ ——— بس ہم کو ساٹھ روپیہ مہینہ ملتا تھا۔ ہڑتال ہوا، یونین والے بھاگ گئے۔ سب سالے نوکر ہو گئے۔ ہم کو دیکھ اب بیس روپیہ مہینہ پر سر مار رہے ہیں۔ مصیبت میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا ہے، ابے اب کوئی یونین والا پوچھنے بھی نہیں آتا۔ چھ مہینہ بھوک مر مر کے کاٹا ہے۔"

بلاقی نے بہادرانہ شان سے جواب دیا۔

"بس اتنے ہی میں ٹھنڈے ہو گئے، کاہے کو گئے تھے یونین میں تب ہم کہیں ——— سنو ——— مل میں جب ہڑتال ہوا، تو ہم بھی تھے، وہاں لڑائی ہو گئی۔ پولیس نے ہم لوگ کے سکریٹری پر لاٹھی چلایا۔ ہم جھٹ سے لاٹھی روک کر سپاہی کو دو چپیٹ مارا! جانو بھیا! کا ہوا!! ہم گرپتار ہو گیا۔ سپاہی سالا نے ——— ہم کو تھانہ میں کھوب مارا اور چھ مہینہ جیل

ہوگیا۔ تمہارے آنے سے پھانسی سے بھی نہ بچا سکے گا۔ مگر اپنا ہک واسطے لڑینگے

جرور۔ اور سب مجبور بھائی کو مل کر لڑنا چاہیئے ــــــــ"

ضمیر چپ چاپ سنتا رہا۔ جیسے کوئی بیوقوف آدمی کسی عقلمند کی

بات سنتا ہو۔ بلاقی اس شان سے بولتا رہا۔ جیسے وہ کسی عظیم الشان مجمع کو

مخاطب کر کے تقریر کر رہا ہو۔ جب بلاقی بول چکا تو ضمیر نے کہا۔

"بول تو بھیّا! ابھی جوان ہو۔ کوئی فکر نہیں، آجاد ہو۔ دو چار بال بچّہ

ہوتا تو معلوم ہوتا ــــــــ"

بلاقی اسی جوش میں بولا۔

"یہ گکت ہے۔ جیتا رہے تو دیکھ لینا ــــــــ"

بوڑھے ہوٹل والے کی عورت اب تک اسی طرح منہ پھلائے بیٹھی

تھی، کبھی زہر بھری نظروں سے بوڑھے کو دیکھتی اور کبھی بڑبڑاتی۔ بوڑھا

ہوٹل والا جلدی جلدی جھوٹے برتن دھو رہا تھا ــــــــ اور

آپ ہی آپ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ ضمیر اور بلاقی دونوں ہی چپ چاپ اپنی

اپنی چائے ختم کر رہے تھے۔ آخر دونوں کی چائے ختم ہوگئی۔ بلاقی نے پوچھا۔

"اور چائے پیوگے ضمیرہ بھیّا!"

"نہیں ــــــــ"

ضمیر نے جواب دیا۔ بلاقی نے پیالی رکھ کر جیب سے ایک ٹین کی ڈبیہ

نکالی۔ اس سے بیڑی نکال کر ضمیر کو دی۔ ایک اپنے ہونٹوں میں دبا کر چولھے سے

آگ لے کر جلانے لگا۔ بوڑھی عورت بڑبڑانے لگی۔ مگر اس نے ذرا بھی پرواہ

کی۔ بلاقی، بیڑی جلانے کے بعد ڈبیہ پہ لگے ہوئے چھوٹے سے شیشے میں دیکھ کر انگلیوں سے بال سنوارنے لگا۔ اور بال سنوارتے ہوئے بولا۔

"بڑے میاں! جرو بھائی کا ناشتہ چائے میرا حساب میں لکھیو——"

اتنا کہہ کر وہ جھونپڑی سے باہر نکلا۔ بولا۔

"اچھا سلام جرو بھیا!"

پھر داہنے ہاتھ سے بالوں کو درست کرتا، اور موٹی آواز میں "مرے مولا بلا لو مدینہ مجھے" گاتا ہوا ایک طرف روانہ ہو گیا۔ بوڑھے ہوٹل والے نے ضمیر سے نصیحت کے انداز میں کہا۔

"کس لونڈے سے بولتے ہو بھیا"

بڑھیا بیٹھی بیٹھی بول اٹھی۔

"ہی ہے کھراب، لونڈا پگلا معلوم ہوتا ہے"

بلاقی کے گانے کی دھیمی دھیمی آواز اب تک جھونپڑی میں آ رہی تھی ؛

شکیلہ اختر

پیدائش ۔ اروَل، گیا ۱۹۱۶ء

یہ خاتون ہیں اور آپ کا محرم۔ تعارف ہی سہی پر شناسائی کیوں؟ اور تعارف میں بھی نگاہ طائرانہ مناسب ہے اس لئے ہلکے پن میں آپ دیکھ بھی کیا سکینگے، پھر آپ کو تو صرف واقفیت حاصل کرنی ہے، کوئی مو انست تو نہیں —— ؟ یہ فنکار خاتون ہیں، مغربی آرٹسٹ نہیں۔ آپ کی آنکھیں کھلی ہیں اور پردہ موجود نہیں، آداب محفل کا تقاضا ہے کہ پھر چراغ دور ہی رکھا جائے —— یہ ہیں محترمہ

شکیلہ اختر ——————————

مجھے ناز ہے اور ناز سے زیادہ مسرت کہ اُردو کی یہ مشہور مقبول اور بلند افسانہ نویس سے میں اتنا ہی قریب ہوں جس قدر روح اور ان کی کلائی کی ننھی سی واچ۔ مطلب یہ ہے کہ جب نزدیک ہوں محترمہ شکیلہ پاس ہیں اور جب دور ہوں یہ غیر! یہ واقعہ ہے "موصوفہ مجھ سے خلوص سے ملتی ہیں، شفقت کا برتاؤ رکھتی ہیں اور الفت سے پیش آتی ہیں۔ یہ مسرت الفت میرا یہ ناز ہے اور ہمارا باہمی تعلق۔

آنے ہی شکایت کرتا ہوں "آپ تو مجھے بھول گئیں ——؟" دیکھتے ہی کہتی ہیں "تم تو ایسا ہو گویا ہو ہی نہیں ——!" اور یہ کہتے

چہرہ نرم ہو جاتا ہے جیسے اُلفت زیرِ خفگی مسرت فزائی چھوڑ جائے ہیں
چپ ہو جاتا ہوں اور یہ خموشی۔ جواب سوال میں اور سوال جواب میں
خلط ملط ہو کر ہم کو ساکت ہی کر دیتا ہے۔

جاڑے کی ایک دوپہر تھی، مکان میں باہر کوئی نہ تھا۔ میں بلا خوف
حویلی میں داخل ہو گیا۔ یہاں بھی کوئی نظر نہ آیا۔ قدرے افسوس ہوا کہ اندر
باہر کسی سے ملاقات نہ ہوئی، آنا بیکار ہی ہوا۔ اچانک ایک نرم سی آواز
کانوں سے آ لگی، جیسے بند لبوں میں کوئی میٹھی سی چیز گنگنائی جا رہی ہو۔ سمجھا
بالائی کمروں میں لوگ موجود ہیں۔ اوپر گیا، کمرہ خالی تھا اور PORTABLE
GRAMOPHONE بند۔ آواز اب آہستہ سے آ رہی تھی۔
اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کسی فرد کا وجود نہ تھا۔ صرف صحن میں دو امرود
کے نیچے سرخ پروں والی چھوٹی چھوٹی دو تین ولایتی مرغیاں ڈربہ کے پاس
بیٹھی دھوپ کھا رہی تھیں۔ قدرے متحیر میں بھاری قدموں کے ساتھ نیچے
اُترنے لگا اور آواز ایک دم رک گئی، میں نے بھی چپ سادھ لی۔
سکوت کچھ دیر موجود رہا، آواز پھر آنے لگی۔ پہلے مدھم سی، پھر زور سے اور
دیکھتے دیکھتے یہ ترنم لے کسی دوسری نیم واضح آواز سے مل کر خاصی ہو گئی۔
نادانستہ دبے قدموں سے میں اس طرف کو بڑھنے لگا۔ کمرہ طعام سے
گزر جانے پر یہ گانا واضح معلوم ہوا۔ سائبان کے بعد غسل خانہ تھا، اور
بیچ بیچ کوئی گا رہا تھا۔ میں کھڑا ہو گیا ــــــ "کیا کر رہے ہو زیدی....؟

کیا کر رہے ہو زبیدی .... ؟" ــــــــــــ دروازہ بند تھا غسل خانہ میں گونجتی ہوئی یہ میٹھی آواز روزن سے گذرتی باہر اب صاف سنائی دے رہی تھی۔ "میں تم کو بھول .... جاؤں .... ؟" ـــ ہر لفظ ہر لفظ کو بہت ٹھہر ٹھہر کر ادا کیا جا رہا تھا اور ایک لطیف لچک سے پھر آپس میں ملا کر سبھوں کو ایک بہتی ہوئی لے میں جھلا دیا جاتا تھا، آواز میں بڑی مٹھاس آجاتی اور ہر ٹکڑا بہتی ہوئی لے میں مدھم ہوتا ہوا ہلکے ہلکے مٹ جاتا۔ ساتھ ہی ساتھ ہر ٹھہراؤ کے بعد دوسرا نرم آہنگ بھی نیم واضح ہو جاتا، جیسے گیت کے پس منظر میں کوئی تیسرا ساز بھی بج رہا ہو۔ نغمہ میں ترنم ہلکا تھا، جیسے کسی ٹین کی چھاؤنی پر بوندیں مسلسل گر رہی ہوں اور ضربیں آبگینوں کی ہلکی ٹکراؤ سے آواز میں میٹھا ابھراؤ بلند کر رہی ہوں۔ ساز کی یہ ہمنوائی گیت میں ایک خواب آگیں نغمہ پیدا کر رہی تھی ـــ "ہر

.... ہر جگہ تو .... تم ہو .... کیسے

.... تمہیں بھلا دوں .... ؟"

خاموش کھڑا غور سے میں یہ لاہوتی نغمہ سننے لگا۔ کبھی گانا رک جاتا اور پانی گرنے کی چھلچھلاہٹ ابھر جاتی پھر اچانک یہ موقوف ہو جاتی۔ اور لے کا نرم بہاؤ پھر نمایاں ہو جاتا ـــ یوں اس جگہ زیادہ ٹھہرنا مجھے نامناسب معلوم ہوا، اور غسل خانہ پہ ایک اچٹتی نگاہ ڈالتا ہوا چپ چاپ واپس ہو گیا۔ کمرے میں پھلوں والی الماری پر "نیا دور" کی جلدیں رکھی تھیں، یونہی ایک کو اٹھا کر دیکھنے لگا، چند ورق الٹتے ہی اس

تصویریں نظر آئیں۔ ممتاز شیریں کے مضامین دیکھے تھے، انہیں دیکھنے کا شرف نہ حاصل ہوا تھا۔ ایک قبول صورت متبسّم تصویر کے نیچے "ممتاز شیریں" پڑھ کر بے ساختہ رسالہ لئے پاس کرسی پر دراز ہو گیا اور رجائی نقوش کو قریب سے دیکھنے لگا۔ "اپنی نگریا" کی ہیروئن اپنی تمام لطیف پھیلاؤ اور رنگین الجھنوں سمیت نظروں میں دفعتاً گھوم گئیں ۔ واقعی پرائی بیتی میں وہ دل گزیں اثر کہاں! نیا دور میری دو پہری نگاہوں سے لگا رہا۔

میری پسندیدہ نظموں میں ایک محبوب نظم "بیتی ہوئی گھڑیاں" بھی ہے ۔ لاکھ التجاؤں پر بھی میں محترمہ شکیلہ اختر سے اُن کی یہ رومانی نظم خود ان کی زبانی انتی سحر انگیز لے میں کبھی نہ سُن سکتا تھا۔ جاڑے کی یہ انمول دوپہر مجھے برابر یاد رہے گی۔

شکیلہ اختر افسانہ نگار ہیں۔ ان کا دل عورت کا ہے اور آنکھیں مرد کی، طبیعت شاعر کی ہے اور شخصیت مصوّر کی۔ حساس دل، چشم وا اور بیدار دماغ نے انہیں ایک کامیاب "ترجمانِ حیات" کا رتبہ عطا کیا ہے۔ سماج کے دریں پرنسائی انگلیوں نے نازک جنبشوں سے وہ نازک دلفریب اور دیدہ زیب گل بوٹے اور نقش و نگار بنائے ہیں کہ عکاسی صداقت میں فن اپنے نقطۂ کمال کو پہنچا نظر آتا ہے محترمہ کی ذات سے بہار کو بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔

شکیلہ اختر نے بہت جلد اپنے افسانوی کیوں سے باغ اُردو
کو گلزار و نکہت فزا بنا دیا ہے۔ اُردو افسانوں میں موصوفہ کا درجہ
بلند تر دکھائی دیتا ہے۔ جب یہ آرٹسٹ خاتون نظر آتی ہیں۔

——— اے عورت تیرا نام شہروزی ہے ———!

"درپن" شکیلہ اختر کے افسانوں کا اوّلین مجموعہ ہے —

"آنکھ مچولی اور ڈائن" دوسرے مجموعے ہیں۔
ہندوستانی عورتوں کے لئے شکیلہ اختر خاص طور پر توجہ کا مرکز ہیں
مردوں کا تو پوچھنا ہی کیا ...... !!

آنکھ مچولی

وہ بچپن ہی سے بہت شوخ، چنچل اور بڑی ہنس مکھ تھی۔ دیکھنے والے اسے دیکھ کر کہتے "ہنستے ہی ہنستے تو گھر بستے ہیں" اور جب اس کی زندگی کا دوسرا اور سب سے اہم دور شروع ہوا تو اس کے تبسم اور زیادہ رنگین ہو گئے۔ اور ہنسی کی سریلی جھنکاریں ستاروں کی طرح تابناک ہو گئیں۔ اسے تنہائی سے وحشت ہوتی تھی اسی لیے وہ رنگ و بو کی طرح ہر محفل پر چھائی رہتی۔ اس سجی سجائی کوٹھی سے ہر گھڑی قہقہے بلند ہوتے رہتے تھے۔ اور احاطے میں سائیکلوں کی قطاریں لگ جاتیں۔ لیکن وقت اور بے وقت بھرے بھرے رکشوں اور آتے ہوئے موٹروں سے وہ اکتا گئی تھی، ایک ہی طرح کے ہنگاموں سے اب اس کا جی گھبرا گیا تھا۔ دن اور رات کے اکثر

حصّوں میں لوگوں کی طرح طرح کی ٹولیاں اس کے یہاں آتیں۔ کچھ اس کے
بھائی کے دوست آتے جن کے آتے ہی ڈرائنگ روم کے پردے کھنچ جاتے،
برج کا دور چلنے لگتا۔ مونوپلی اور کیرم کے کھیل کھیلے جاتے، پھر اس کے
دیور اور دوسرے بھائی کے ساتھی آتے۔ موٹی موٹی لال پیلی جلدوں کی
کتابیں دبائے، کبھی تو اُن کے آتے ہی کمرے بند ہوکر پڑھائی شروع ہو جاتی
اور کبھی وہ بلّے اور گیند لئے ٹینس لان پر آ جھکنے لگتے۔ اور ہر روز شام
ہوتے ہی گیارہ بجے رات تک اس کے شوہر فیض کے ملنے والے آتے
رہتے۔ ڈرائنگ روم برآمدہ اور کبھی سامنے کا احاطہ کرسیوں سے بھر جاتا۔
پھر تو شاعری اور فن شاعری کے جام چھلکتے اور ادب کی باریکیاں بیان
ہوتیں۔ فیض کا ذوق ادب بہت بلند اور اس کا مشاہدہ بہت گہرا تھا۔
وہ ایک کامیاب ادیب تھا، جس کے افسانے، ڈرامے، تنقید اور نظموں
میں زندگی کی جاگتی ہوئی لہریں رواں اور دواں رہتی تھیں، کبھی زندگی کے اہم
اصول اور دنیا کے نظام پر نگاہیں دوڑائی جاتیں، گہرے اور دقیق مسئلوں
اور ان کی باریکیوں پر تبصرے ہوتے۔ قہقہے گونجتے، ہنسی کی لہریں اُٹھتیں۔
اس کی کوٹھی میں زندگی لہراتی رہتی مگر یہ سب کے سب ہوتے ہوئے بھی وہ
گھر کے اندر اپنے کو ایک بے پناہ وسیع خلا میں تنہا محسوس کرتی۔ ایک
عرصہ تک انہی قہقہوں اور ہنسی کی ان ہی موجوں میں اپنے کو فریب دیتی
رہی تھی۔ دیر دیر تک پردے کے پیچھے کمرے کے دریچے پر بیٹھی ان کی باتیں
سنتی، ان کے تماشے دیکھتی اور بیل کے شربت، انڈے کے حلوے،

ناشتے اور چائے سے ان کی خاطریں کرتی رہتی تھی۔ پس پردہ اس نے ان رنگینیوں میں اپنے کو بہلانا چاہا تھا مگر اب اسے اس گھر سے وحشت ہونے لگی تھی، یہ اس کا گھر نہیں تھا۔ زندگی کی شاہ راہ پر ایک پُررونق کلب تھا اور اس کا جی چاہتا کہ اس کا اپنا بھی کوئی ایک گھر ہوتا۔ بارہ سال کا ایک طویل عرصہ وہ اس کلب میں گزار کر اب تھک گئی تھی۔ تاش کے پتے اکیرم کی کھٹا کھٹ اور مونوپلی کی ہار جیت میں وہ اپنی زندگی کی شکست ہی شکست دیکھ رہی تھی، بلّے اور گیند کی ہر ایک ضرب نے اس کے دل کو مجروح کر دیا تھا اور ادب، دنیا اور نظام حیات کے گہرے گہرے تبصروں نے اس کی زندگی کے ہر تار و پود کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر بکھیر دیا تھا۔ گھر میں ان سے ہنگاموں کے ہوتے ہوئے بھی وہ خود ایک اُجاڑ ویرانہ میں ایک اکیلی ٹھنٹھ درخت تھی۔ اپنی سجی ہوئی کوٹھی سے اب اس کا جی بیزار ہو چکا تھا، سارے گھر بھر اور ڈرائنگ روم کی حسین آرائش سے وہ اکتا گئی تھی۔ اپنی تنہائیوں سے پریشان ہو کر وہ دن بھر میں کتنی کتنی دفعہ اپنے ہاتھوں سے گھر کی ایک ایک چیز جھاڑتی رہی تھی، مگر ان ساری چیزوں سے اب اس کا دل بھر گیا تھا، ایک مدت سے ان لٹکتی ہوئی تصویروں کو دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ آتش ویراں پر رکھے ہوئے خوبصورت کھلونوں پر مہین مہین گرد دیکھ کر بھی اب وہ بے پرواہ رہتی۔ کارنس پر سجائی ہوئی گڑیاں بارہ سال سے بس ایک ہی طرح سے بیٹھی پڑی تھیں۔ رنگ برنگ کی کچکڑے اور مٹی کی گڑیاں، جن کے کپڑے

نمک کی طرح گل کر اب پھٹتے جا رہے تھے اور ان کے چہرے پر جگہ جگہ سے خراشیں پڑ گئی تھیں، مگر وہ بے حس و حرکت ٹھکے ہوئے انداز میں بارہ سال کی طویل مدت سے مسکرائے جا رہی تھیں۔ اس کو محسوس ہوتا جیسے وہ خود بھی مٹی یا کچکڑے کی ایک بے جان گڑیا ہے۔ اس پر بھی ایک جگ بیت گیا تھا اور وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی سرک نہ سکی تھی۔ اس کی روح کی دھجیاں بھی تار تار ہو چکی تھیں اور مٹی کی گڑیوں کے چہرے سے کہیں زیادہ کھرچنیں اس کے دل پر پڑ گئی تھیں۔ ان ہی کی طرح اس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ وہی مردنی سی بے حس مسکراہٹ، اب تک وہ انجان طور پر ایک بچہ کی طرح ان کھلونوں سے کھیلتی رہی تھی، نقلی کھلونے اور مٹی کی بے جان گڑیوں سے — مگر یک بیک اتنے دنوں کے بعد اب اس کا جی بے اختیار چاہنے لگا تھا کہ کمرے کے ان ریشمی پردوں سے لپٹ لپٹ کر کوئی جھولتا رہے، اس کی روح کو ایک طوفان کا انتظار تھا، اور وہ اس آندھی میں گھر کی ایک ایک چیز کو تتر بتر دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا جی چاہتا کہ کوئی لمبا بانس لیے ان چمکتی ہوئی ساری نفیس تصویروں کو گرا کر چکنا چور کر دے اور اس کا منہ چڑاتی ان مسکراتی ہوئی بے حس گڑیوں کو توڑ توڑ کر کوئی اس کی نگاہوں سے انہیں دور کر دیتا۔ وہ چاہتی تھی کہ میز اور کرسیاں اوندھی رہتیں اور رنگا رنگ کے شیشے پر بڑے بڑے دھبے پڑے رہتے، اس صاف ستھری اور جھلملاتی ہوئی کوٹھی سے اب اس کا جی اکتا گیا تھا۔ وہ کوئی تبدیلی چاہتی تھی۔ ایسی۔

اہم تبدیلی جو گھر کے کونے کونے پر چھا جائے۔ لمبے بانسوں میں ریڈیو کے ایریل
دیکھتے ہی بیتابانہ اس کا دل چاہتا کہ گھر کے ایک ایک چھجے میں وہ رسی
کی کھونڈی پھدی الگنی ٹانگ کر ان پر ننھے ننھے بے شمار کپڑے پھیلا دے،
عجیب عجیب طرح سے بے ہنگم کپڑے جو کبھی اس گھر میں استعمال نہ ہوئے
بنتے۔ سب سے زیادہ اس کو اپنی بیکاری کھلتی رہتی۔ سارا
کا سارا دن پڑا رہتا۔ وہ کتابیں پڑھتے پڑھتے تنگ جاتی۔ ایک ہی جگہ
سے آخر کتنی دیر وہ لکھتی رہتی۔ لکھی ہوئی سطریں جب اس کی نگاہوں کے
سامنے ناچنے لگتیں۔ تب وہ اُٹھ کر اکیلی کوٹھی میں بے مقصد چکر لگاتی،
باورچی خانہ کے در پر کھڑی نوکروں کی باتیں سنتی، ڈاکیہ کی آواز سنتے ہی
وہ خود ہی ڈاک لینے چلی جاتی۔ ترکاری والی دھوبن اور دودھ والیوں
سے وہ خواہ مخواہ کی مہمل باتیں دیر تک کرتی رہتی۔ ایسا کرتے ہوئے اس کی
خودداری کو ٹھیس لگتی اور وہ تلملا کر رہ جاتی۔ ایسی باتیں اس کی شان
کے خلاف تھیں۔ پھر وہ کیا کرتی، کچھ وقت تو جیسے تیسے کر کے گزر جاتا تھا۔
مگر آخر کب تک۔ ایک ہی شاہ راہ پر کھڑی اپنے کو فریب دے سکتی تھی!

اس کی کوٹھی سے لگی ہوئی دوسری کوٹھی میں گھوش بابو رہتے۔ خوبصورت
نازک بیوی، خوش نظر اور خوش سلیقہ۔ ان کی کوٹھی اور احاطے کا ہر ہر
کونا گلزارِ جنت بنا رہتا۔ انہیں پھولوں سے فطری طور پر ایک جنونانہ عشق
تھا۔ وہ خود بھی اسی شاخ کے ایک شگفتہ سے پھول نظر آتے اور ان کی
بیوی اس گلدستے کے سارے پھولوں میں سب سے زیادہ نمایاں اور حسین

پھول تھیں، وہ سچ مچ ایک گلدستہ جیسے لگتے۔ شگفتہ، خوبصورت، رنگین اور خاموش ــــ ایک گہرا سکون ان کی کوٹھی پر ہر وقت چھایا رہتا، مگر جب سے ننھا گلاب ان کے درمیان آگیا تھا، تب سے ان کے گھر میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی، دُبلا پتلا حسین سا بچہ جب غوں غاں کے بعد اپنے کمرے کے دریچہ پر کھڑا ہوکر "ماں، ماں" کہہ کر شور مچانے لگا تو ایک دن پروین اپنے دریچہ سے پکار کر بولی "گلاب! ماں نہیں امی بولو امی ــــ" اور یہ اس کا گلاب نام بھی اسی نے رکھا تھا۔ ننّھی ننّھی انگلیوں سے دریچہ کے جنگلے کو پکڑے وہ ایک روز تک تو چُپ چاپ سے وہ پروین کی "امی امی" کہتی ہوئی آواز کو سنتا رہا۔ اس کے بعد سے دریچہ کے سفید پردے کے اُوپر سے اُچک اچک کر چیخنے لگا ــــ "امی! امی!" پہلے تو پروین نے سمجھا کہ گلاب اپنا سبق یاد کررہا ہے، مگر جس دن اس نے یہ محسوس کیا کہ سارا سارا دن اور کبھی رات کو بھی امی امی کہہ کر وہ خود اُسے پکارنے لگا ہے تو ایک عجیب سی تڑپ اس اس کے دل میں پیدا ہوئی۔ "امی ــــ امی" یہی پیاری سی آواز سُننے کی وہ کتنے دنوں سے منتظر تھی ــــ اس سے پہلے بھی کئی دفعہ اس کی روح میں پُرخلش انگڑائیاں اُبھری تھیں۔ مگر اس آواز نے اسے ہولناک طور پر بیدار کردیا تھا۔ یاقوت کی طرح سُرخ لب اور گھنی گھنی سیاہ آنکھوں والا حسین سا بچہ جب اس سے لپٹ لپٹ کر کہتا "امی" ــــ تو وہ اکیلے میں اس کے سفید گالوں پر اپنے بھیگے ہوئے رخسار رکھ کر کہتی ــــ "میرا گلاب۔ میرا گلاب"۔ وہ اس کے سارے گھر بھر میں ایک تتلی کی طرح

دوڑتا رہتا۔ اور جب گھوش بابو کی بیوی گلاب کو پروین کے پاس رکھ کر گھوش بابو کے ساتھ کسی اچھی سی انگریزی فلم دیکھنے چلی جاتیں، تو پروین تھوڑی دیر کے لئے یہ بھول جاتی تھی کہ گلاب کس کا بچہ تھا ۔۔۔! اسی گلاب اور گلاب کی مسلسل پکاروں نے اس کی روح میں ایک خلفشار مچا دیا تھا۔!

یک بیک بارہ سال کی طویل مدّت کے بعد پروین نے اپنے میں ایک مبہم سی تبدیلی محسوس کی اور یکایک اس کا دل نئی نئی کیفیتوں سے ہم آہنگ ہونے لگا۔ رستے ہوئے جذبات نے ایک دھارے کی طرح اس کی رگ رگ میں ہل چل مچا دی تھی اور وہ اپنے خواب و خیال کے حسین تصورات میں کھوئی ہوئی سی رہنے لگی ۔۔۔ "امّی ۔۔۔ امّی" کہتا ہوا گلاب جب اس کی گود میں آنے کو مچلنے لگتا، تو وہ اسے آہستہ سے تھپتھپا کر بہلا دیتی ۔۔۔ "گلاب! تم گلاب ہو نا؟ اور تمہیں ایک ننھا چنبیلی کا پھول دوں گی' لو گے نا؟" ۔۔۔۔۔۔ پھر اس کی نگاہیں چنبیلی کے اس حسین سے پھول کے تصوّر پر جم جاتیں۔ نازک خوبصورت ننھا سا چہرہ، بڑی بڑی معصوم سی آنکھیں، سر پر اسی کی طرح گھونگر بالے بال، چھوٹی چھوٹی انگلیوں والا مہندی لگا ہوا سا پاؤں کبھی ہنستا کبھی بلکتا ہوا پھول کی پنکھڑیوں جیسا یاقوتی ہونٹ ۔۔۔ یہ سب کیا ہو رہا تھا، وہ ایک آرٹ کی تخلیق کر رہی تھی اور اُسے خود ہی معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسا شاہکار بنا رہی ہے۔

فیض نے جب یہ خبر سُنی تو مسرت سے وہ جھوم گیا۔ پھر اس کی بڑی خاطریں ہونے لگیں۔ اس کے سونے کے کمرے میں سُرخ سُرخ شاداب امریکن

سبب خوش رنگ نارنگیاں اور بلور کی طرح چمکتے ہوئے دانوں والے انگور کے خوشے رکھے جانے لگے۔ فیض حسن کا پرستار اور شعر و ادب کا ایک آرٹسٹ تھا۔ اسی لئے وہ چاہتا تھا کہ نیند سے بیدار ہوتی ہوئی پرمیشر کی نگاہوں کا پہلا ٹھہراؤ حسین اور لطیف ہو اور انہی رنگینیوں اور شادابیوں کی آمیزش وہ پردین کے اس آرٹ میں دیکھنا چاہتا تھا ــــ!

پردین اپنے دل و دماغ پر چھائے ہوئے کیف و سرور سے گھبرا کر کبھی کبھی سوچتی کہ دنیا کی اس پرانی روایت کو وہ اتنی اہمیت کیوں دے رہی ہے۔ ایک ایک گلی میں کتنے کتنے بچے پڑے ہوئے تھے۔ پیسے میں دو دو ملنے والی گڑ کی مٹھائی اور رینگتے بلبلاتے ہوئے بچوں کی اس دنیا میں کوئی کمی نہ تھی۔ اور ایک ہی وقت میں ان دونوں پر کتنی مکھیاں بھنکتی رہتی تھیں۔ شاید خود عرصہ ہی انتظار طویل ہو کر اپنی قدر کرانے لگتا ہے! اور اگر یہ بارہ سال کا ایک جگ نہ بیت جاتا تو چمبیلی کا نازک سا پھول اس کے لئے اتنا خوشبودار نہ ہوتا۔ اسی لئے بیچارہ گلاب چھوٹے چھوٹے سے قصور پر بھی اکثر پٹ جایا کرتا تھا۔ پھول کی ایک کلی اور ایک کالے سے بیگن توڑ لینے کے جرم میں گوش بابو نے اسے کئی دفعہ مارا تھا۔ گلاب کے لئے صرف پردین کی ایک اکیلی گودی پرسکون تھی وہ اپنی سزاؤں کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ کسی قصور پر بلا کہے سنے بھی اپنے ہاتھوں سے دونوں کان پکڑے وہ اپنے مخصوص کونہ میں کھڑا ہو جاتا، مگر جب اس کو اکیلے کمرے میں بند ہونے کی سزا دی جاتی تو وہ دریچے پر چڑھ کر زور

زور زور سے پکارتا — "امّی! امّی" اور پروین اپنے سارے کام چھوڑ کر اپنے کمرے کے دریچے سے لگ کر گلاب کے سامنے کھڑی ہو جاتی — پھر گلاب اپنی زبان میں شکایت شروع کر دیتا — "امّی! امّی! ہم کو ماں۔ بن بن"۔ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے کبھی پروین کو ایک لطیف انبساط ہوتا۔ وہ لیٹی لیٹی سوچتی رہی، اور بہت سے خوبصورت نازک نازک سے معصوم بچے اس کے پاس چکر لگاتے، کبھی نزدیک اور کبھی اس سے بہت دور — اس کے گرد منڈلاتے ہوئے ننھے ننھے سے کلبلاتے ہوئے کبھی کبھی اس کی روح سے سرگوشیاں کرتے "چھاپنی پھو"۔ اسے ٹیگور کی کہانی یاد آ کر دکھلا دیتی۔ پھر اسے لگتا جیسے بارہ سال سے چھپے ہوئے اس کے بہت سے پھول جیسے بچے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اب اس سے بہت قریب آ رہے تھے۔ "امّی تا"۔! اسے گھر کے کونے کونے سے یہی آواز آتی ہوئی محسوس ہوتی — "امّی تا"۔ "امّی تا"۔ — لیکن اس آواز کے ساتھ اس کو افسانہ کی وہ بچی یاد آ جاتی جسے تا بولنا نہ آتا تھا اور وہ الماری، شلف اور کواڑوں کے پیچھے چھپ چھپ کر اپنی ماں سے بس یہی ایک کھیل کھیلا کرتی "امّی چیکو" — "امّی چیکو"۔ اور اس کی ماں جان بوجھ کر اسے ڈھونڈتی پھرتی، مگر اس بچی کی آیا اس منحوس کھیل کھیلنے سے ان کو اکثر منع کرتی تھی اور آخر ایک دن بچارہیں سر کو دھنتی "امّی چیکو"۔ امّی چیکو"۔ کہتی ہوئی وہ بچی اپنی ماں کو ڈھونڈتی ہوئی ہمیشہ کے لئے چھپ گئی تھی — اور اب یہی تکلیف دہ آواز پروین کو سنائی دے رہی تھی۔ سارے لوگ خوش تھے۔ زندگی

کی ایک مچلتی ہوئی لہر گھر بھر میں دوڑ گئی تھی ——— وہ کمزور ہوتی جا رہی تھی لیکن نقاہت کے اس پردے میں اس کی بیتابانہ مسرتیں چھپی ہوئی تھیں۔ ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنوں کی طرح اس کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا فیض نے بار بار اُسے ڈاکٹر کو دکھانا چاہا، مگر پروین کو ڈاکٹر کے نام سے وحشت ہونے لگتی۔ ایک مبہم سا خوف اس کے سارے جسم کو کپکپا دیتا۔ شاید شاید یہ اس کی روح کا ایک فریب ہو۔ اور اگر یہ صرف ایک خواب تھا تو وہ اسے ہمیشہ اپنی آنکھیں بند کئے دیکھتی رہنے کی آرزومند تھی۔

اس کی کمرے کے چاروں طرف دیوار میں خوبصورت سے فریم میں کئی تصویریں فیض نے لاکر خاص طور پر اپنے ہاتھوں سے لگائی تھیں۔ کسی کے بال گھنگریالے تھے، کوئی بھولے بھولے گالوں والا بچہ منہ چھپائے ہوئے ہنس رہا تھا، اور کسی کا مسکراتا ہوا پیارا سا چہرہ کوئی ٹکٹکی باندھ کر اس کی گود میں آنے کو مچل رہا تھا اور کسی طرف سے بلکتا ہوا بچہ اپنے ننھے ہاتھوں سے اسے بلا رہا تھا ——— پروین کو ان تصویروں سے شدید طور پر محبّت ہو گئی تھی ——— یہ سارے بچّے اس کے تھے۔ صرف اسی کے بارہ سال سے چھپے ہوئے یہ ہنستے بلکتے اور ہمکتے ہوئے اتنے سارے بچے ایک ہی دفعہ اس کی خالی گود میں آنے کو مچل رہے تھے۔ پروین انہیں دیکھ کر کبھی کبھی تڑپ سی جاتی۔ وہ ان کے نزدیک جاتی۔ بھولے بھولے گالوں اور بلاتی ہوئی ننھی ننھی انگلیوں کو دیوانہ وار چوم چوم کر کہتی "میرے بچّے، میرے لال تم کیسے ہو تمہیں

اپنے کلیجے میں بٹھا لوں"۔۔۔ سجے ہوئے کمروں کو دیکھتی ہوئی وہ انتقام سوچتی ۔۔۔ تمہاری سفیدیاں میرے دل پر چرکے لگاتی رہی ہیں، اب یہاں ہر ہر جگہ دھبے نظر آئیں گے، دودھ کی شیشی رہے گی۔ ہورلکس کی بوتلیں رہیں گی اور دہکتی ہوئی انگیٹھی اور ہر طرف اس کی راکھ بکھری پڑی رہے گی وہ اس کوٹھی کا منہ چڑھا چڑھا کر بہت سی الگنی ٹانگے گی اور ان کرسیوں پر بہت سے بے ہنگم سے کپڑے پھیلے رہیں گے۔ اس گھر کی زینت و آراستگی سے وہ تھک گئی تھی۔ اسی لئے ہر ہر طریقے سے وہ اپنی روح کی اس بیزاری کا اعلان کرے گی ۔۔۔ گلاب بہت زیادہ نزدیک رہ کر اب اس سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ پروین کی نگاہیں پھولوں کے حسین ڈھیر میں اپنے لئے ایک انوکھے پھول کا انتخاب کر رہی تھیں۔ مگر اس کا وہ لہکتا ہوا پھول اس کے تخیل سے بھی بہت بلند تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے بہت سے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگاتے رہتے۔ کبھی تصویر میں چنبیلی کی نازک پنکھڑیوں کی طرح ننھے ننھے ہاتھوں کو بیتابانہ چومنے لگتی اور کوئی "اتی! اتی" کہتا ہوا اس کے کلیجے سے لپٹ جاتا۔ مگر کبھی کبھی یاس کے ہیبت ناک جھولے میں اس کا مضطرب دھڑکتا ہوا دل جھولنے لگتا۔ "ہاں"۔۔۔ "نہیں"۔۔۔ "ہاں"۔۔۔ "نہیں"۔۔۔! جھولے کی پرانی رسی ہر ایک پینگ لینے پر مچمچا رہی تھی اور پروین یہ نہیں جانتی تھی کہ وہ "ہاں" اور "نہیں" کے کس کنارے پر گرے گی۔ کاش یہ مچمچاتی ہوئی رسی کبھی نہ ٹوٹے اور وہ "نہیں" سے گزرتی ہوئی بھی "ہاں" کے کناروں سے ٹکرا کر جھولتی رہے!

گلاب کی ایک ٹوٹی ہوئی ننھی سی کلی گھوش بابو نے گلاب کے ہاتھ میں دیکھ لی۔ باپ کی نگاہوں کو پہچان کر گلاب سہم گیا۔ گھوش بابو اپنا غصّہ برداشت نہ کرسکے وہ زور سے "چلّائے"؟ نکلو یہاں سے، نکلو یہاں سے" گلاب اپنی آنسوؤں سے بھری ہوئی حسین آنکھوں کو اپنی ننھی ننھی انگلیوں سے ملتا ہوا اپنے گھر کے پھاٹک سے باہر نکل آیا اور روتا ہوا گلاب دوسرے پھاٹک سے ہوکر سیدھا پروین کے پاس چلا آیا اور اس کی گود میں منہ چھپا کر سسک سسک کر رونے لگا۔ پروین کی آنکھیں بھی پُرنم ہوگئیں اور وہ فطرت کی اس غلط تقسیم کو اپنے سینے سے لگائے اُسے زور زور سے بھینچ کر پیار کر رہی تھی ۔ گلاب پھر اپنے کھیل میں لگ گیا۔ وہ کمرے میں دوڑ دوڑ کر چوں چوں کر کے پھدکتی ہوئی گوریا کو پکڑنے لگا۔ اس نے گوریا کی دم پکڑنی ہی چاہی تھی کہ اس کے ہاتھ کی ٹھوکر سے میز پر رکھا ہوا گلاس چھن سے گر کر چور چور ہو گیا۔ گلاب اپنی جگہ پر سہم گیا۔ یک بیک اس کے ننھے ننھے ہاتھ اوپر اُٹھے اور وہ اپنے کان کو پکڑے کونے میں کھڑا ہونے کو جا رہا تھا کہ پروین دوڑتی ہوئی آکر اس سے لپٹ گئی اور بے اختیار اس کے مُنہ سے نکل گیا "میرا بچّہ! میرا لال"! پروین کو تو یہ "چھن" کی آواز بڑی پیاری لگی تھی اور کاش وہ اس پیاری سی آواز کو ہر روز سنتی رہتی۔ گلاب کے لئے اس کے تصور پر پروین کا اتنا بیتابانہ پیار ایک نئی چیز تھی، وہ اسے حیرت سے تکتا ہوا اپنا سفید سفید ہاتھ پروین کے گلے میں ڈال کر محبت بھری خوشامد سے کہنے لگا۔ "امّی! امّی"!

پروین کی صحت کی کمزوری سے گھبرا کر آخر فیض نے لیڈی ڈاکٹر کو بلا ہی لیا۔ ذبح ہوتا ہوا بکرا جس طرح قصائی کی چمکتی ہوئی چھری کو دیکھ کر لرز جاتا ہے اسی طرح پروین لیڈی ڈاکٹر کو دیکھ کر کانپ گئی۔ اُمیدوں کے جھولے میں زور زور سے پینگیں پڑنے لگیں اور جھولے کی وہ پرانی مچمچاتی ہوئی رسّی اس کے سامنے ٹوٹتی ہوئی سی لگ رہی تھی "ہاں"۔ "نہیں" دونوں کناروں سے اس کی روح زور زور سے ٹکرا رہی تھی۔ اس نے اپنی آنکھوں کو بند کر لیا کہ وہ اپنا آخری انجام نہ دیکھ سکے۔ جھولے کی رسّی ٹوٹ رہی تھی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے اپنا فیصلہ سُنا دیا تھا۔ اس کی روح میں ایک زبردست دھماکا ہوا اور اس کو لگا جیسے گھٹا ٹوپ اندھیرے چھا گئے ہیں۔ کوٹھی کے سفید چونے اور کمروں کی سجاوٹیں اس طوفان میں بجلی کی طرح رہ رہ کے چمک رہی تھیں۔ ہنستی بلکتی اور مہکتی ہوئی تصویریں گہری تاریکیوں میں چھپتی جا رہی تھیں۔ ایسے اندھیرے اور ایسی آندھی میں اس کے کانوں میں ایک آواز آئی "امّی تا" اور اس کی دیوانہ وار روح بیتابانہ طور پر دوڑتی ہوئی اسے پکڑنا چاہ رہی تھی، مگر اس بڑھتے ہوئے طوفان میں آواز کا فاصلہ دور مٹتا جا رہا تھا "امّی تا" "امّی تا" اور پھر ہولناک اندھیرے میں یہ آواز ہلکی ہوتی ہوتی ڈوب کر رہ گئی۔! فطرت اتنے دنوں تک پروین سے ایک ہولناک آنکھ مچولی کھیلتی رہی تھی، اور پروین کے بےبس ہاتھ "امّی تا" کی اس آواز کو نہ پکڑ سکے تھے، وہ اپنے کمرے میں تکیہ سے لپٹی ہوئی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "میرے بچے میرے لال"

ح۔ م۔ اسلم عظیم آبادی

پیدائش — بانکی پور، پٹنہ۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء

تعلیم — ایم۔ اے (اردو)

چراغ نیا ہے۔ بتّی اور تیز کی جائے، آپ انہیں پہچان نہ سکیں گے۔
یہ ہیں ۔

______ ح، م، اسلم عظیم آبادی

مجھے شک ہے آپ نے انہیں دیکھا ہو۔ او رنزدیک آجائیے۔ جی ہاں'
یہ نوجوان ہیں اور عمر کے پختہ، پر اس پختگی کے باوجود گھر سے باہر ہونے میں
ہچکچاتے ہیں۔ رنگ زعفرانی اور سرخی سے تقریباً مفقود؛ اُبھرا ہوا نقشہ
نکلتا ہوا قد، دُبلے پتلے، لبوں کی نشست میں ایک معنی خیز تبسّم جیسے "میں
جانتا ہوں تم مجھے چھیڑو گے" ______ اور واقعی مدیران، اڈیٹران
اور دوسرے سرپھرا انہیں برابر چھیڑتے رہتے ہیں۔ اسلم کی چیزیں بہت
تھوڑی ہیں۔ چند فسانے، دو چار مقالے، ایک آدھ نظم اور بس۔ بیچارے
پھر دامن نہ چھوڑائیں تو کیا کریں۔ نمود و نمائش سے دبکتے پھرتے ہیں۔ یاروں
نے زبردستی "بزم ادب" بانکی پور پٹنہ کی سالانہ تقریب پر انہیں مع شیروانی
و پاجامہ ڈائس پر اچانک اچکا دیا۔ حاضرین نے تالیوں سے ان کا خیر مقدم
کیا۔ یہ لجا گئے، اور بہت بے آبرو ہو کر بلا جھجک اپنی ایک آزاد نظم پیش کر دی۔
صدر شعبۂ اردو پٹنہ کالج نے اٹھ کر فوراً کہا "میں نظم آزاد یا معرّا کا شدید مخالف

ہوں اور ایسے مجذوب کی بڑ تصوّر کرتا ہوں اور اسلم کی آزاد نظم سن کر آج مجھے مسرت ہے کہ اپنے ارادہ میں ترمیم کر رہا ہوں ۔" ہال تالیوں سے گونج اُٹھا' پھر فرمایا" اس لئے اسلم صاحب سے گذارش ہے کہ وہ ایک بار اور اپنی کیف پرور نشاط انگیز نظم سے ہمیں محظوظ کریں ۔" تالیاں تیزی سے بجنے لگیں ۔ اسلم اثر زدہ ہو گئے اور بجائے ڈائس کے سیڑھیوں ہی پر اپنی نظم سنانے کھڑے ہو گئے ۔ آوازوں اور فقروں نے توجہ دلائی اور دوبارہ جب اپنی مخصوص نرم اور شیریں آواز میں سنانے لگے تو سامعین صامت تھے ۔ موت سی خاموشی میں اسلم کا سوز قلب نوائے ساز سے ہم آہنگ شعلۂ حیات سا متوز تھا — !

آدمی سنجیدہ' متین اور باوضع ہیں، جلدی کھلتے نہیں، لیکن کھل جاتے ہیں تو دور رہنے کو جی نہیں چاہتا ۔ چند مخصوص افراد کا ایک حلقہ رکھتے ہیں ۔ جسے ان کی شخصیت سے گہری محبت ہے ۔ تضیع اوقات پر بڑی نگاہ رہتی ہے ۔ سینما نہیں دیکھتے ۔ استوران یا کیفے نہیں جاتے اور گپ نہیں کرتے ۔ ہاتھ کی گھڑی پر برابر نگاہ ہوتی ہے اور سکنڈ والی سُرخ سوئی پر گہری ۔

حیات کا ایک نصب العین رکھتے ہیں' تو زندگی کے ہر زاویہ اور ہر پہلو پر جھکنا رہتا ہے ۔ سُنتے ہیں، ایک بار سارا دن محزون و مغموم اور خموش بیٹھے رہے ۔ دوسرے دن محلہ کی کسی تقریب سے جب ان کی کرسی واپس آ گئی تو اس پر والہانہ جا بیٹھے اور اس دن مسرور و شاداں اپنا نظام الاوقات انجام دیا ——— کرسی کی مفارقت بے کلی اور بے کاری کا سبب تھی

نشست و برخاست، ملنا جلنا، رہنا سہنا سب ایک مخصوص و منفرد انداز و اصول سے ہوتا ہے۔ نفاست، نرمی اور ندرت کے نادر نمونے ان کی ہر شے میں نمایاں ہوتے ہیں۔ " ن " کی یہ موانست گویا اسلم کی زندگی کا مایۂ حیات ہے۔ ملنے والے کہتے ہیں کہ اسلم سے مل کر اور ان کے امن کدہ کو دیکھ کر دوہری اور انتہا درجے کی مسرت ہوتی ہے اور دونوں کی شدت مساوی ہوتی ہے۔

افسانوں کا رنگ یہ ہے :—

کلیم الدین کہتے ہیں "...... افسانہ اچھا لکھ لیتے ہیں۔ مشاہدہ کی صلاحیت ہے۔ نگاہیں تیز ہیں اور گہری ......"—

پروفیسر اختر اورینوی نے اسلم کی افسانہ نگاری پر گفتگو کرتے ہوئے فرمایا— "...... اردو افسانوں کا ابھی تک ایک گوشہ خالی پڑا تھا۔ ہمارے فن کاروں کی نگاہ اس طرف نہ گئی تھی — دنیائے اطفال اسلم کے افسانہ کا کردار کوئی ادھیڑ عمر، جوان، نوجوان مرد نہیں بلکہ چھوٹا سا بچہ ہوتا ہے، تین چار برس کا ننھا ہیرو یا ہیروئن جس کی بے سمجھی، ان کہی، انوکھی اور اچانک باتیں اور حرکتیں ان کے افسانوں کا پلاٹ ہوتی ہیں ... . اسلم کی یہ شاہراہ ان کے شاہکار کی منتظر ہے ......"

دُولن بھابی

"میاں بندرے سے کام ہے ـــــ ان کو جا کے بلا لاؤ......"
پھر وہ لہجہ کی لذت میں ڈوبتے ہوئے ہی والہانہ یہ گیت گنگنانے لگا۔
چھوٹے سے کمرے میں اس کی باریک آواز کی بجتی ہوئی لطیف گونج اسے محسوس کرا رہی تھی کہ وہ بالکل عورتوں جیسا گا رہا تھا، درمیان میں رکھا رکھا کر ہولے ہولے گیت کی لے میں وہ ویسا ہی نغمہ پیدا کر رہا تھا۔
ٹائمس ویکلی سے پھاڑا ہوا ورق اس کے سامنے پڑا تھا اور وہ اس سے نکالی ہوئی تصویر کو تک رہا تھا۔ رسالہ کے صفحہ سے لال پیلی نیلی رنگوں والی تصویر اس نے بہت احتیاط سے نکالی تھی۔ یہ ایک حسین لڑکی کی پوری

فوٹو تھی جو ساری کی جدید تر روش میں ملبوس، غالباً مشرقی حسن و وضع کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ دھانی رنگ پر گہرا فالسئی رنگ کا چوڑا حاشیہ لڑکی کے پیروں سے اوپر اُٹھتا ہوا اس کے جسم پر ایک نیلے سانپ جیسا لپٹا ہوا نظر آرہا تھا۔ لڑکی کی بڑی بڑی آنکھیں شرمگیں تھے اور یہ بڑی بڑی آنکھیں شرمگیں تھیں اور یہ بڑی نزاکت سے آنچل کا ایک کونہ پکڑے زمین تک رہی تھی۔ اس نے ایک بار پھر تصویر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا لیا اور اس کے ساتھ ہی اس کی آواز بھی ذرا اونچی ہو گئی —— "ہاں ان کو...... جا کے ...... بلا...... لاؤ...... میاں بندے سے کا...... م ہے ان کو جا کے......" پورا گیت تو اس کو یاد نہ تھا اس لئے وہ صرف اس ٹکڑے کو بار بار طرح طرح سے گانے لگا۔ کبھی "کام" کو خوب کھینچتا اور کبھی "بلا لاؤ" کے درمیان ہلکا سا وقفہ دے کر "کام" کو رگڑنے لگتا۔ اسی طرح وہ پورے گیت کا مزہ لے رہا تھا۔ بہت ہی سرشار اور وارفتہ ہو کر۔ اس کی مخلوط گویائی اور بصارت مشترکہ طور پر اس کے دل و دماغ میں ایک واحد اور مکمل تصویر قائم کر رہی تھی اور وہ تھی "دولن بھابی!" کی —— "دولن بھابی" گاتے ہوئے اور دیکھتے ہوئے وہ سوچنے لگا "ٹھیک دولن بھابی کی فوٹو ہے یہ...... ویسا ہی چہرہ، اتنا ہی اونچی، ویسی ہی گلابی ناخن والی انگلیاں —— خالی ایک بات، ایک بات نہیں ہے اس میں......"

اور جیسے نگاہ تصویر سے علیحدہ ہوتے ہوئے اور اس بات کو یاد کرتے

لگا۔ جب موم بتیوں کے دھندلکے میں اس کی دولہن بھابی کو زیوروں اور پھولوں سے خوب سنوار بنا کر عورتیں انہیں ہولے ہولے چال چلا رہی تھیں ــــ اس رات دولہن بھابی کی پیشانی پر کیسے اچھے اچھے چاند تارے اور طرح طرح کے ٹیکے لگے تھے۔ گورے گورے چہرے پر ان کے سیاہ ہونٹ اور وہ چمک دار ٹیکے کتنے بھلے لگتے تھے۔ دولہن بھابی سر جھکائے چپ چاپ بالکل آہستہ آہستہ چل رہی تھیں اور موم بتی کی روشنی میں گوٹوں سے کیسی کیسی روشنی نکلتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کی چوڑی بلند پیشانی پر خالی تارے ہی لگے ہیں، ننھے ننھے تارے جو بالکل آسمانی ستاروں جیسا جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ چھوٹی آپا، بہن جان، ممی جان اور عمرانہ باجی اور بڑی پھوپی اور خالہ جان اور گھر کی سب لوگ دولہن بھابی کے دونوں جانب ہاتھوں میں لانبی لانبی اجلی موم بتیاں لئے تھیں اور ان کی ہلکی ہلکی روشنی میں دلہن بھابی اپنے سارے ڈھیر سے گہنے اور پھولوں کا زیور پہنے بالکل خالہ کی گڑیا معلوم ہو رہی تھیں! ــ اپنے ہاتھ کی تصویر سے ایک دم چوتھی کی دولہن بھابی نظر آ رہی تھی ـ اس کی نگاہیں تصویر پر گڑی تھیں اور تصوّر میں کھویا وہ چال چلانے والا گیت گا گا کر اس رات کے منظر کو دیکھنا ہوا انتہائی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ " جوڑا لال پہنے ان کو جا...... کے ...... بلا لاؤ .... " لال جوڑا کہتے ہی اس کو یکایک خیال ہوا کہ تصویر میں ساری کا رنگ تو دولہن بھابی کی ساری جیسا نہ تھا۔

ان کی ساری توجہ دلہن بھابی کے ہاف پینٹ جیسی بالکل نیلی تھی۔ جس پر بڑے بڑے بڑے چھوٹے چمکیلے بہت سے چمکیلے پتے بنے تھے۔ ساری سے بہت اچھی خوشبو آ رہی تھی۔ جس کی مہک بھی ان کے ہاتھوں کی مہندی جیسی تھی۔ گاتے گاتے لمحہ بھر کے لئے پھر وہ یکایک رک گیا اور زور کی ایک سانس لے کر منہ میں زبان کو پھیرتے ہوئے پھر گنگنانے لگا۔ مگر اس بار اس کی آواز ابھر نہ سکی۔ جیسے اس کی گویائی تصور میں ڈوب گئی ہو اور ساری توجہ باصرہ سے ہمکنار ہو رہی ہو۔ وہ پھر سوچنے لگا ——

" دولن بھابی —— رات آپ کا پیر خوب دکھا ہوگا " دوسرے دن جب صبح سویرے وہ ان کے کمرے میں گیا تھا تو اس نے دولن بھابی سے یہی پوچھا تھا " کتنی دیر میں آپ اُسارے سے اپنے کمرے میں گئیں ۔" تصویر گرچہ اب تک ویسی ہی اس کے ہاتھوں میں اس کی نگاہوں سے لگی تھی، مگر دور ذہن میں ایک دوسری تصویر دیکھ رہا تھا اور چپ چپ ذہن بخود اس میں مزہ لے رہا تھا۔

"ہاں ننھے بھائی! تمام رات پیر میں درد رہا " انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔ پھر یہ اپنے ٹھنڈے ٹھنڈے مہندی لگے ہاتھوں سے اس کے دونوں رخساروں کو چومتی ہوئی بولی تھیں " اور تم ذرا پوچھنے بھی نہ آئے۔ آئیں ننھے ؟"

اس وقت دولن بھابی کے بازوؤں کی پُرکیف خوشبو اور ان کے ہاتھوں کی نرم و سرد لمس سے کچھ دیر کے لئے اس کی عجیب طرح کی کیفیت

ہو گئی تھی۔ وہ ادھ کھلے ہونٹوں سے دولہن بھابی کے چہرے پہ پانی کے ان
چھوٹے چھوٹے قطروں کو دیکھنے لگا تھا، جو آہستہ آہستہ انکے گورے چہرے
سے سرکتے ہوئے ان کے پیازی شلوکے پر گر رہے تھے۔ دولہن بھابی فوراً
ہی منہ ہاتھ دھو کر واپس آئی تھیں اور اب ان کی پیشانی پہ رات والے
چاند تارے موجود نہ تھے۔ دھلے ہوئے خوبصورت چہرے پہ یہ بوندیں
اسے بے حد پیاری لگ رہی تھیں اور وہ انہیں غور سے دیکھتا رہا۔ پھر
بھابی جان کے ہاتھ جب اس کے رخساروں سے الگ ہو گئے تھے، ننھے
قطرے چہرے سے ٹوٹ چکے تھے اور ان کے ہاتھوں کی چوڑیوں کی
کھنکھناہٹ اس کے کانوں سے آ لگی تھی تو اس نے کہا تھا "جی اور
بھیا جان جو تھے" یہ دولہن بھابی کی شکایت کا جواب تھا اور اس کی
اپنی شکایتیں بھی۔ "ہاں تمہارے بھیا جان تو تمام دن یہاں گھسے رہتے
ہیں" یہ کہتے ہوئے دولہن بھابی کا چہرہ ہلکا سا گلابی ہو گیا تھا۔ جسے
ننھے کی آنکھوں نے خود بھی دیکھ لیا تھا یہ بالکل عجیب ہو گیا تھا کہ اس
کا کیا جواب دے۔ دولہن بھابی ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھیں۔ بھیا جان
سچ مچ بہت دیر تک ان کے کمرے میں رہتے تھے۔ کبھی مسہری پہ لیٹے
ہوتے اور پاس ہی دولہن بھابی مسکراتی رہتیں۔ لیٹے ہوئے بھیا
جان کی آنکھیں دولہن بھابی کے چہرے سے اس طرح لگی رہتیں جیسے
رجو ماموں کیرم کھیلتے ہوئے اکثر بورڈ پر لال رنگ والی گوٹی کو دیکھا کرتے
۔۔۔ کبھی بھیا جان کمرے میں ان چیزوں کو درست کرتے ہوئے انہیں

ان کے جانے کے بعد بہن جان، عمرانہ باجی اور چھوٹی آپا وغیرہ خواہ مخواہ
اُٹھا کر اِدھر سے اُدھر رکھ دیا کرتیں مثلاً سنگار میز پر انڈہ جیسی نقشی
ہوئی سنہرے فریم والی تصویر جسے یہ ہمیشہ تھوڑا کج کر کے گلدان کے نزدیک
رکھتے یا پھر مسہری کے پاس جو ایک چھوٹا سا ٹیبل تھا۔ اس پر
اچھی اچھی جلد والی کئی کتابیں قرینہ سے سجی ہوئی رکھی ہوتیں، انہیں عمرانہ
باجی اور بہن جان ہمیشہ اُٹھا اُٹھا کر ایک ذرا دیکھتیں اور پھر اِدھر
اُدھر ڈال دیتیں۔ جب بھیّا جان کمرے میں واپس آتے تو ان گری
پڑی اونچی نیچی کتابوں اور بے قرینہ رکھی ہوئی تصویر کو دیکھ کر تھوڑا غصّہ
ہو جاتے۔ اور خفا ہو کر کچھ بولتے جاتے اور پھر انہیں ٹھیک کرنے لگتے۔
پر ایسا کم ہوتا تھا، اکثر ہی اس نے دیکھا تھا کہ بھیا جان اس کی دلہن
بھابی کے پاس بیٹھے ہوتے اور بہت ہی مسکرا مسکرا کر ان سے باتیں
کرتے رہتے۔ نہ جانے کیا باتیں ہوتی تھیں۔ یہ اتنی ہی میٹھی، اتنی ہی ملائم
اور اتنے ہی پیار بھرے انداز میں آرزو کی ماں بھی کھیلتی شاہینہ
سے اسی طرح کی باتیں کرتیں پر آرزو کی ماں کی باتیں تو بس ایک ہی طرح
کی ہوتی تھیں "میری سونا ہے ...... کہ ہیرا ہے ...... کہ چاند ہے۔
...... کہ جگنو ہے ...... کہ ......" اسے کبھی حیرت
بھی ہوتی کہ اتنی بڑی شاہینہ چاند یا جگنو کیونکر ہو سکتی ہے۔ جگنو تو اس نے
دیکھا ہی نہ تھا، پر شاہینہ اس کے سامنے چاند جیسی کبھی اونچی یا چمکیلی نظر
نہ آتی تھی۔ اور سوچتے سوچتے جب آرزو کی ماں کی یہ تکرار آوازیں پھر اس

کانوں میں آتیں تو وہ اندر ہی اندر ان کی اس بے مطلب بات پر بگڑ جاتا۔
"ایک دم طوطا ہیں یہ طوطا۔ خالی ایک بات بکتی رہتی ہیں" غصّہ
میں وہ اتنا کہتا ہوا ادھر سے گذر جاتا پر بھیا جان کی باتیں؟ ــــ ؟ اس نے
ایک بار ان کو سمجھنے کی کوشش کی تو ان ڈھیر سی میٹھی نرم اور پیار بھری باتوں
میں اس کو صرف یہ چند الفاظ سمجھ میں آئے ــــ "خوبصورت آنکھیں....
ترشے ہوئے لب........" دولن بھابی بھیا جان کی ان باتوں سے
کبھی تو بالکل شرما جاتیں اور کبھی جواب میں صرف ایک دو لفظ بول دیتیں
اور اس پر بھیا جان جلدی سے دو انگلیوں سے ان کی ٹھوڑی پکڑ لیتے اور
دولن بھابی کا ہلکا سا ایک پیار کر لیتے! ــــ ننھے کو یکایک جھری سی لگی
اور اس نے جلدی سے منہ کا لعاب سانس کے ساتھ پی لیا پھر
وہ یکایک اس تصویر کو فرش کی دری کے نیچے چھپا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔
سامنے صحن سے گذر کر امرود کے درخت کے پاس دولن بھابی کا
کمرہ اس وقت بھی بند تھا۔ گویا اب بھی وہاں بھیا جان موجود تھے۔ ان کے
کمرے کو حسرت بھری نگاہوں سے تکتے ہوئے اس نے صحن میں ایک غیرارادی
چکر لگا کر دالان کا رُخ کیا، جہاں بہت سے لوگ تھے۔ اُسے خود بھی خیال
نہ تھا کہ وہ وہاں کیوں جا رہا ہے۔ دالان میں عمرانہ باجی، ممی جان، بہن جان،
فہمیدہ اور چند دوسری لڑکیاں اور عورتیں سوئی پڑی تھیں۔ ممی جان اور
عمرانہ باجی سبھوں سے الگ شیشے والی الماری کے پاس ایک پلنگ
پر لیٹی تھیں۔ یہ آپس میں اس طرح بات چیت کر رہی تھیں، جیسے یہ

ہینیا سے اس وقت کیا کرتا جب ہینیا اس کے ساتھ والے کھیل میں شریک نہ ہوتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی اس کے ساتھ کھیلتی اور ہینیا "ننھے میاں، بڑی دلہن بگڑیں گی تب"، کہہ کر خواہ مخواہ ناراضامندی کا اظہار کر دیتی۔ وہ ہینیا کو طرح طرح سے بھلا پھسلا کر آمادہ کرتا "اچھا، جانی نہیں نے" پہلے وہ عاجزی سے کس بھرے لہجہ میں کہتا۔ ہینیا اسے دیکھنے لگی۔ "جاؤ ہینیا تو ہم بھی تم سے نا بولتے ہیں"۔ نہ بولے جانے کا خیال ہینیا کو تھرا ہی دیتا۔ کیونکہ جس دن ہینیا نہ بولے جانے کا خیال دلانے کے باوجود کسی کھیل میں شرکت نہ کرتی اس دن اس کا بہت نقصان ہوتا، مثلاً اس دن شام کو نہ چپکے سے اسے ننھے میاں کے ناشتے کے جیب لگے ہوئے بسکٹ ملتے اور نہ اس مٹھائی کا ٹکڑا ملتا جس کا شکر لگا ہوا ناریل چاکلیٹ جیسا مزیدار ہوتا تھا۔ وہ چیزیں یاد آتے ہی کچھ دیر بعد ہینیا من جاتی اور ان کا وہی پرانا کھیل شروع ہو جاتا۔ ہینیا سگریٹ کے خالی ڈبے میں چپ چاپ سے پانی بھر لاتی۔ یہ سرکی کے ٹوٹے قلم سے مٹی کو کرید کر جمع کرتا۔ آنکھیں بچا کر صحن باغ سے مالتی، صنوبر اور جوہی کی ننھی ننھی ڈالیاں توڑی جاتیں، ردی ٹوکری سے پھٹے ہوئے پوسٹ کارڈ اور موٹے کاغذ ڈھونڈے جاتے اور دونوں دوپہر کو گھر کے کسی گوشہ میں مکان، باغ اور تالاب کی تعمیر میں منہمک ہو جاتے۔ نقشہ بنتا، دیواریں اٹھتیں، چھاؤنی ہوتی اور اگر بڑی بھابی یا آرزو کی ماں کی نظر ان کی اس خاموش پرسکون سکھ بھری زندگی پر پڑ جاتی تو بے فکر زندگی کے باقی کھیل وہیں ختم ہو جاتے۔ دراصل پھر گھروندہ کی تعمیر کے بعد ہینیا کو لھیا ٹکرے

اور دوسرے لوازمات دے کر گھر سے وابستہ کر دیا جاتا۔ ننھا پپیتا کی
سوکھی ڈنٹھل اپنے ہاتھ میں لئے لکڑی کے گول گول بنائے ہوئے چند
پیسے اوپر والی چھوٹی سی جیب میں بھر کر پیٹ کی فکر میں باہر نکل جاتا۔
چیزیں آتیں سودے آتے، کھانا پکتا۔ دونوں اکٹھے ہوتے، کھاتے
اور باہم نرم نرم سرگوشیاں شروع ہو جاتیں ــــ بالکل اسی طرح کی
سرگوشیاں ممی جان اور عمرانہ باجی میں ہو رہی تھیں "توبہ بڑی گندی ہیں
آپ" عمرانہ باجی نے مسکرا کر منہ پھیر لیا۔ "اللہ رے" ممی جان نے کہا
"اچھا ہم بھی دیکھیں گے نا" ننھا کھڑا ان کی باتیں سنتا رہا۔
"اچھا دیکھئے گا نا" عمرانہ باجی نے جواب دیا۔ پھر اسے دیکھ کر
بولیں "ننھے میاں کل تمہاری دولہن بھابی اپنے گھر جا رہی ہیں" ــــ
"ہش" عمرانہ باجی کی یہ بات اسوقت اسکو ذرا بھی اچھی نہ لگی۔ انہوں نے کیوں
کہا۔ کون سی اچھی بات تھی یہ! ایسی ہی باتوں سے تو وہ بھابی جان سے
بگڑا رہتا ہے۔ بھیا جان کی شادی میں جب سبھی کے لئے نئے نئے کپڑے
اور جوتے آرہے تھے تو اماں کے پاس بیٹھی ہوئی بڑی بھابی نے اس سے
کہا تھا "ننھے میاں، انعام کی شادی میں تمہارے لئے جوتا اور کپڑا نہ آئیگا"
ــــ اس وقت بھابی جان کی یہ بات اس کو کتنی بری لگی تھی۔ وہ
جانتا تھا کہ انعام بھیا خود ہی اس کی قمیص کے لئے مہین مہین سوراخوں
والا زرد کپڑا خرید کر لا چکے ہیں اور ابا نے اسے وہ جوتا لا دینے کا وعدہ
کر دیا تھا جس کی ننھی سی گول کرڈی کھینچتے ہی جوتے میں دانتوں جیسی لوہے

کی سلائیاں الگ جاتی تھیں۔ پھر خواہ مخواہ ان کو یہ بات بھولنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس وقت اس کے جی میں آیا تھا کہ وہ بھابی جان کا خوب زور سے منہ چڑھا کر بھاگ جائے۔ اب یہ عمرانہ باجی کی بات ..... ؟ سچ مچ بالکل چڑھانے والی ہی تو تھی۔ اس نے سوچا۔

ان کی بات سُنی اَن سُنی کرتا ہوا وہ دالان میں دو چار قدم یونہی گھومنے لگا۔ فرش پر سوئی ہوئی عفت کی ناک میں سُرخ رنگ کا بلبیر دیکھ کر اس کو دولن بھابی کی وہ انگوٹھیاں یاد آئیں جن پر سُرخ اور نیلا چمکدار پالش لگا تھا اور جن کے ہر طرف ننھی ننھی گول گول کڑیاں تھیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے گھنگھرو ں پروئے تھے۔ دولن بھابی کے ہاتھ ہلنے اور انگوٹھیوں سے پیاری پیاری "چھن چھن" کی آوازیں نکلتی تھیں۔ ایک بار جب وہ دولن بھابی کے کمرے میں گیا تھا تو ان کے تمام زیورات چھاپی تکیہ کے پاس رکھے تھے، وہ انگوٹھیاں بھی اسی جگہ تھیں۔ اس نے ایک انگوٹھی کو اپنے ہاتھ میں لے کر ہلا ہلا کر خوب بجایا تھا۔ پھر جب دولن بھابی دوسرے کمرے سے منہ دھو کر روپہلے چاندوں والی عنابی ساری پہن کر آئی تھیں تو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی انگلی میں ایک انگوٹھی پہنا دی تھی۔ اتنی سی انگلی میں ان کی انگوٹھی اسے بالکل ڈھیلی ہو رہی تھی۔ دولن بھابی نے اُسے دیکھتے ہوئے ایک بارگی زور سے اپنے ہاتھوں میں لے کر اس کی انگلیوں کو چوم لیا تھا۔ "میرا پیارا ننھا بھائی" انہوں نے کہا تھا "کتنا میٹھا پیارا ہے" اور اس وقت اس کے گال کا ایک ننھا سا پیار بھی لے لیا

تھا انہوں نے ...... اس واقعہ کی یاد کے ساتھ اسے بڑی بے اطمینانی محسوس ہوئی اور اپنے ماتھے کو ہاتھوں سے پونچھتے ہوئے وہ ان لوگوں کی بات چیت میں شریک ہوئے بغیر دالان سے خاموش باہر نکل آیا۔

دوسرے کمرے میں بڑے بڑے صندوقوں کے پاس جہاں نعمت خانہ بین دادی اماں کا بونٹ جھولا کرتا تھا، شاہینہ مہین جالی والے سبز ٹاپے میں سو رہی تھی۔ بڑی بھابی کی یہ چھوٹی سی بچی اس کو بڑی محبوب تھی۔ وہ اسے بہت چاہتا تھا اور اس کی لامعلوم مسرتوں اور کھلونوں میں بے تکلف شریک ہو جاتا۔ پر آرزو کی ماں جس کی صورت اس کو سب سے خراب اور گندی لگتی تھی، ہمیشہ اسے ان مواقع سے ڈانٹ کر الگ کر دیتیں اور اسی وجہ سے وہ ان سے بالکل نفرت کرتا تھا۔ "بس اے میاں تو" وہ اسے دیکھتے ہی ہر سے اس کی چھوٹی شکایت کرنے لگتیں۔ "سوتے لڑکے کا منہ چوما نہ باپ خوش نہ ماں خوش"۔ حالانکہ اس نے کبھی بھی سوتی یا جب شاہینہ کو جاگ کر نہ رلایا تھا۔ اس کا پیار ایسا تھا ہی نہیں۔ وہ تو صرف جھک کر بہت آہستہ سے شاہینہ کے ملائم رخساروں کو گردن ہلا ہلا کر اپنے نتھنوں سے سونگھا کرتا۔ جب اس کے نتھنے اور شاہینہ کے رخسار آپس میں خوب سٹ جاتے تو اس کو بڑا اچھا معلوم ہوتا اور اسی کیف پر وہ لذت سے سرشار وہ اپنی گردن کو اور بھی ہلانے لگتا۔ بس یہی اس کا پیار تھا۔ نہ اس میں شاہینہ کے گلے پر تھوک لگتے اور نہ دانت کے نشان اُگتے۔ ہاں جب اس کا پیار ختم ہو جاتا تو اس جگہ شاہینہ کے نرم گالوں پر اسے

ہلکی ہلکی سی لالی نظر آتی، جسے وہ آہستہ آہستہ اپنی انگلیوں سے چھو کر مٹانے کی کوشش کرتا۔ ایسا کرتے ہوئے اسے شاہینہ کے رخسار کے وہ ننھے ننھے سنہرے بال دکھائی دیتے جو اتنے نرم ہوتے کہ اس کا جی چاہتا کہ وہ انہیں بس چھوتا ہی رہے۔ اب جب شاہینہ نہ جانے کیوں آہستہ آہستہ منہ بلکا کر رونا شروع کر دیتی۔ آرزو کی ماں دور ہی سے شور مچاتیں لڑی بھابی فوراً ہی ڈانٹتیں۔ اس وقت ان کا چہرہ اچھا نہ ہوتا؛ اور تب گوشمالی کے خوف سے اداس دل کے ساتھ ہلکی چالوں سے یہ فوراً وہاں سے کھسک آتا —— بھابی جان سے اس کی بیزاری کی یہ بھی ایک معقول وجہ تھی۔ ان کا خواہ مخواہ اسے تنگ کرنا اور شاہینہ کے پاس جانے سے روکنا، ان دونوں باتوں کی وجہ سے بھابی جان اس کو اتنی اچھی نہ لگتی تھیں۔ سبز ٹاپے کی چھت سے لٹکتی ہوئی کپڑے اور روئی کی رنگ برنگ چڑیاں ساکت تھیں۔ اس کے جی میں آیا کہ ٹاپہ کو اٹھا کر ذرا شاہینہ کو دیکھ لے، ٹاپہ ہلنے سے چڑیاں بھی ہلنے لگیں گی اور وہ شاہینہ کا پیار بھی کر لے گا۔ پر شاہینہ کے پاس ہی چھوٹے سے کھٹولے پر پھیلی ہوئی سوئی آرزو کی ماں دکھائی دیں، اور وہ ہچکچا گیا۔ دو چار قدم چل کر اس کے پیر رک گئے، اس نے شاہینہ کو دیکھا پھر اپنی پیشانی کے زیریں حصہ اور ناک کو سکیڑتا ہوا وہ اس جگہ سے واپس مڑ گیا۔

اب آخر وہ کہاں جائے۔ کیا کرے۔ یونہی چلتے چلتے وہ سوچنے

لگا "دولن بھابی صبح کو اپنے گھر چلی جائے گی" عمرانہ باجی کی بات اسے یاد آگئی اور دولن بھابی کے چلے جانے کا خیال اُبھر گیا —— بیچاری دولن بھابی ...... کتنا جلدی چلی جائے گی یہ ...... پہلے آئی تھیں تو اتنا جلدی چلی گئیں۔ پھر اتنا دن بعد آئیں تو پھر چلی گئیں...... یہ جانا آنا کا ہے ہے۔ بڑی بھابی تو یہاں کتنا سا دن تک برابر رہتی ہیں۔ جمعہ، شبرات، ہردم تو یہ یہیں رہتی ہیں ...... پھر دولن بھابی اتنا جلد کیوں چلی جائیں گی —— دولن بھابی کا جلد چلا جانا اور بڑی بھابی کے بہت دن رہنے کا مسئلہ اس کی سمجھ میں مطلق نہ آیا۔ وہ جتنا اس بات پہ غور کرتا اسی قدر اس کے ابہام پر اس کا غصہ بڑھنے لگتا —— اور ان کو کوئی آدمی روکتا بھی نہیں —— یہ سوچ کر اسے اور پریشانی ہو رہی تھی —— پہلی بار جب جانے لگیں تو بھی کسی نے کچھ نہ کہا اور آج بھی اتنا جلدی جا رہی ہیں اور کوئی منع نہیں کرتا —— اس کا چھوٹا سا جوتا زمین پر بے انداز قدموں کے ساتھ اب قدرے وزن سمیت پڑ رہا تھا، جیسے وہ بہت غصہ میں تمام لال چیونٹیوں کو پیروں سے مسل مسل کر مار رہا ہو، گویا اس نے ان کا بگاڑا بھی نہ ہو اور انھوں نے اس کی ہتھیلی یا گردن میں چمٹ کر بلاقصور بہت زور سے کاٹ لیا ہو؛ بالکل ویسے ہی ہمارے مسلتے ہوئے چالوں سے گھر میں کسی کے دولن بھابی کو نہ روکنے پر بگڑتا ہوا وہ اٹ پٹانگ چل رہا تھا —— پھوپھی اماں دولن بھابی کے جانے کے بعد ہی جا رہی تھیں تو سب لوگوں نے ان کو

روکا تھا - اماں، بڑی بوبو، ممی جان، خالہ اماں، چھوٹی باجی، بھابی جان، تمام نے ان کو کتنا روکا تھا - اماں نے کہا تھا کہ آخر ایسا بھی کیا آنا - اگر جانا ضروری ہی ہے تو دولہن کی چوتھی کے بعد چلی جانا...... اور کتنی طرح سے چھوٹی اماں کو سب لوگوں نے روکا تھا........ پر دولن بھابی........؟ دولن بھابی کو لوگ کیوں نہیں روکتے؟ انس کے دل نے انتہائی حیرت سے پوچھا۔

"شبراتن! شبراتن؟" تونت کے نیچے ٹنگے ہوئے طوطا نے کہا— "بول، کاٹ، شبراتن!— شبراتن!؟— کا" دادی اماں کے بعد گھر میں طوطا کا ہی سب سے زیادہ خیال کرتا تھا جس دن دادی اماں کے بار بار آواز دینے کے بعد بھی شبراتن طوطا کو نوٹ دینا بھول جاتی تو یاد آتے ہی یہ خود نعمت خانہ سے بوٹ کی چھوٹی ڈگری لانے دوڑ جاتا۔ ہر روز دادی اماں کے لئے بھلائے ہوئے بوٹ تر کپڑے سے ڈھانک کر ڈگری میں رکھ دیئے جاتے۔ دوسرے یا تیسرے دن بوٹوں سے انکوا چھوٹ جاتا اور دادی اماں بڑے بڑے انکرے والے بوٹ ہر دن ناشتہ میں کھایا کرتیں۔ یہ ڈگری لاکر دادی اماں کو دے دیتا، اور خود فرش کے نیچے سے وہ چوکیا اٹھا لاتا جس پر بیٹھ کر دادی اماں وضو بنایا کرتی تھیں۔ چوکیا بہت چھوٹی سی تھی اور اس کے گھٹنوں اتنا اونچی۔ اپنے دونوں ہاتھوں سے چوکیا اٹھاتے ہوئے یہ اسے لے جاکر تونت کے نیچے رکھ دیتا۔ پھر دوڑ کر دادی اماں کے نکلے

ہوئے بونٹ اپنی مٹھی میں لے آتا اور مچیا پر چڑھ کر اطمینان سے مٹھی کا سارا بونٹ طوطا کی کٹوری میں ڈال دیتا۔ اس کے پنجڑے میں ہاتھ ڈالتے ہی طوطا اپنے دیدے بدلتے ہوئے پیالی کے پاس چلا آتا۔ پنجڑے میں گرچہ ننھے کی انگلیاں اس کی چونچ کے پاس ہی ہوتیں، مگر طوطا کبھی ان پر حملہ نہ کرتا۔ اسی طرح طوطا کو ناشتہ یا کھانا اسی کے ہاتھوں ملا کرتا۔ طوطا اس سے بہت مانوس ہو گیا تھا۔ جب یہ اسے بولنے کو کہتا طوطا کچھ نہ بولتا صرف بہت خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہتا۔ پھر اس کے جاتے ہی فوراً کہتا——

"شبراتن؟— شبراتن؟؟——" کا بول "شبراتن" اور دور کھڑا ہوا ننھا مسرت سے طوطا کی بات سنتا رہتا۔ طوطا نے اس کے علاوہ اور کچھ بولنا نہ سیکھا تھا۔ ہاں کبھی کبھی گھر کی مرغیوں کی طرح عجیب عجیب قسم کی آوازیں نکالتا رہتا۔ ننھا کو اس کی بولی سے زیادہ اس کی یہ آوازیں پسند تھیں، وہ بہت نہال ہو کر اسے سننے لگتا۔ طوطا نے اسے جاتے ہوئے دیکھ کر پھر پکارا "شبراتن؟— شبراتن؟؟— کا بول کا" ننھا نے اس کے پنجڑے پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی اور آگے بڑھ گیا۔

"کل دولن بھابی چلی جائیں گی" دولن بھابی کے چلے جانے کا احساس اور کسی کے ان کو نہ روکنے کا خیال اسے متفکر بنائے ہوئے تھا۔ اس وقت تصورات میں کھویا، دولن بھابی کی پیار بھری نرم میٹھی باتوں کے پہچانی خیالات میں پریشان وہ اپنے سے بے خبر اور اپنی دنیا سے بے خبر بالکل بے ارادہ اور بے تحاشہ ہو رہا تھا۔ نئی نئی دولن بھابی

جو اتنی بڑی ہونے کے باوجود بہت آدر ان سے اس کی ساتھی ہو گئی تھیں،
اس کو طرح طرح سے بلایا کرتی تھیں۔ اس کی ننھی ننھی اندھ کہی باتیں سن کر
گود میں لے کر اس کا پیار کر لیتیں، اس کی محبوب ترین توجہ ہو رہی تھیں۔ ان
کا نیاپن، ان کا دلار اور ان کا پیار تھنے کی زندگی میں سب سے اچھی سب سے
عزیز اور سب سے محبوب بات تھی۔ اماں کے پیار سے بھی زیادہ اچھی، ہبینا
کے کھیلوں سے بھی زیادہ عزیز اور طوطا کی بولیوں سے بھی زیادہ محبوب۔ اس
کے بیشتر گھنٹے بلکہ تمام دن دولن بھابی کے پاس گذرا کرتے تھے۔
ان پانچ چھ دنوں میں ہبینا کے ساتھ کھیلنا تو جیسے وہ بالکل ہی بھول
چکا تھا، کیونکہ اب دادی اماں کے متواتر کہنے پر طوطا کو اس کے ہاتھوں
سے بوٹ ملنے تھے۔ ہاں شاہینہ کو پیار کرنا اس سے ہنوز نہ بھولا گیا تھا
ممکن ہے یہ محض اس وجہ سے اب تک اس کے شعور میں محفوظ تھا کہ جب
دولن بھابی کا کمرہ بند ہوتا تو اس وقت بند کواڑ اور در سے لگے ہوئے
پردے دیکھ کر برآمدے سے واپس پھرتے ہوئے اس کو ہلکا سا ملال
ہوتا، اس کے دل میں کسک ہوتی اور وہ بنا کر وہ دانستہ شاہینہ کی طرف رخ
کرتا۔ شادی کے ہنگامہ کی وجہ سے شاہینہ کے پاس اس کو تنہائی اکثر
مل جایا کرتی اور وہ مزے میں اس کے ساتھ بیٹھا کھیلا کرتا۔ ادھر
بھیا جان کمرے سے نکلتے اور ادھر اس کے قدم کمرے کی طرف اٹھ جاتے۔
آج دولن بھابی سے زیادہ بات کرنے کا اس کو موقع نہ ملا تھا۔ صبح
سویرے صرف تھوڑی دیر کے لئے وہ ان کے کمرے میں گیا تھا۔

دولن بھابی کپڑے بدل رہی تھیں۔ ان کو سلام کرکے وہ چاہتا تھا
کہ ان کے پاس بیٹھ کر وہ اپنے سوچے ہوئے عجیب عجیب سوالات
اور اجابی باتوں کا سلسلہ چھیڑدے۔ مگر گھر میں دوئی موٹی مہمانوں کے
آجانے پر بڑی بھابی فوراً ہی دولن بھابی کو بلاکر اپنے ساتھ لے گئیں۔ وہ پھر
بھر ان لوگوں کے شامل رہیں۔ نہ جانے کون کون تھیں وہ۔ اماں جان
نے جب اُسے کہا کہ دیکھو یہ تمہاری فرخندہ پھوا اور گن نانی ہیں تو ان
کی پرانی صورتیں دیکھ کر ان کو سلام کرنے کو اس کا ذرا جی نہ چاہا تھا۔
وہ ان کے آنے پر اور بھابی جان کے دولن بھابی کو بلا لینے پر کڑھ سا گیا تھا۔
ہلکی سی خفگی کے ساتھ یہ ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ پھر تنہا صفدر بھیا کے
کمرے میں تصویروں والے ڈھیر سے پرچے اُلٹ پلٹ کرتے ہوئے ایک
پرچہ میں دولن بھابی جیسی ایک خوبصورت فوٹو دیکھ کر اسے بہت
خوشی محسوس ہوئی تھی۔ وہ کئی منٹ تک فوٹو طرح طرح سے دیکھتا رہا۔
رنگی ہوئی چھپی چھپائی دولن بھابی کی تصویر پاکر اسے بڑی مسرت ہوئی
تھی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے پرچہ میں سے وہ ورق پھاڑ لیا
تھا، اور جلدی جلدی اُسے تہ کرکے اپنے قمیص میں چھپا لایا تھا۔ صبح
کے پانچ چھ گھنٹے تو اس طرح گذر رہے تھے۔ دوپہر کو بھیا جان کا کھانا
کمرے میں آتے ہی دولن بھابی اُٹھ کر چلی گئیں، اور ننھے کو ان کے
پاس بیٹھنے کا موقع ہی نہ ملا —— کل دولن بھابی چلی جارہی تھیں
شام کو ان کے کمرے کا دروازہ کھلے گا۔ ناشتہ کے بعد ہی پھر بھی جان

عمرانہ باجی، ممی جان وغیرہ ان کو گھیر لیں گی۔ پھر زانت ہو جائے گی۔ بھیّا جان آ جائیں گے۔ کمرہ بند ہو جائے گا اور وہ دولن بھابی کے پاس پھر نہ بیٹھ سکے گا۔

—— ننھا اپنی بے بسی اور مواقع کی نا واقفیت پر دل ہی دل میں غصہ ہو رہا تھا۔ چلتے چلتے اُسے ناگہانی پتہ چلا کہ وہ دولن بھابی کے کمرے کے پاس آ گیا ہے۔ کمرہ بند تھا، گویا بھیّا جان اندر تھے۔ برآمدہ میں خفیف سی ہوا چل رہی تھی، جس سے در کے پردہ کے سلوٹوں میں جنبش دوڑی پیدا ہو جاتی۔ اچانک ننھے کے جی میں آیا کہ دروازے سے جھانک کر وہ ایک ذرا دولن بھابی کو دیکھ لے۔ ان کو دیکھے کافی دیر ہو چکی تھی۔ —

"نہ جانے دولن بھابی کیا کر رہی ہیں؟" بے ساختہ اس کے دل نے جاننا چاہا! "بیچاری دولن بھابی" جاگی جاگی سیماب انگیز محبت نے ابھی سہارا دیا "کل تو چلی ہی جائے گی یہ" اس نے سوچا اور آہستہ سے قدم بڑھاتے ہوئے ادھر اُدھر دیکھ کر اس نے پردہ کا کونہ پکڑ لیا۔ پٹ بند تھے۔ وہ پردے کو ہٹاتے ہوئے دروازہ سے آ لگا اور ہلکے سے دونوں ہاتھوں سے پٹ کو دبایا، چند لمحے تک وہ دروازے سے لگا اندر جھانکنے کی کوشش کرتا رہا۔ بائیں طرف پٹ کے ایک لانبے شگاف کی جوف سے اس کو دولن بھابی کی مسہری نظر آئی —— وہ اور قریب ہو گیا اور جھک کر جوف سے سٹ گیا ——————

دولن بھابی سوئی تھیں اور بھیّا جان بھی ان کے پاس ہی تھے۔ دولن بھابی کے ادھ کھلے ہوئے بازو جن میں صرف دو تین باریک چوڑیاں

تھیں، ایک کج ہو کر شلوکہ کے پاس تھا اور دوسرے ہاتھ میں کھلی ہوئی لانبی پیازی انگلیاں ان کے گلابی رخسار پہ چھتر ائی تھیں۔ انگوری ساری کے اندر بھابی کا سویا ہوا مسکراتا چہرا جس کے لبوں میں ننھا سا خلا نظر آ رہا تھا، اتنا خوبصورت تھا کہ اسے دیکھتے ہی ننھے کے بے کیف اور ہلکا دل سے مسرت کی ایک ہلکی سی آبشار پھوٹ پڑی۔ سیل انبساط اس کے متفکر، پریشان اور تھکی ہوئی صورت کو اچانک شاداب بنا گیا۔ اس نے ایک گہری سانس کھینچی، جیسے ایک بوجھ اتر گیا ہو۔ اس کے دونوں لب علیحدہ ہو گئے اور رخساروں کی گولیاں ابھر پڑیں۔ وہ چوکھٹ سے اور قریب ہو گیا، اتنا کہ اس کی بھنویں اور بالائی پیشانی کا حصہ بھی شگاف سے مٹ گیا۔ کمرے میں چھت سے لگا برقی پنکھا زور شور پر چل رہا تھا۔ دولہن بھابی کے آنچل سے نکلے ہوئے سیاہ بال کے چند چھوٹے چھوٹے لچھے رخسار سے لگی ہوئی انگلیوں اور کان کی لو کے پاس زیادہ نمایاں ہو کر ہوا سے ہولے ہولے اڑ رہے تھے۔ فرط طرب سے ننھے کی سانس رک کر تیز ہوتی ہوئی ابھرنے لگی۔ چوکھٹ سے اندر کمرے کی ہوا ہلکی ہلکی سیٹیاں بجاتی اس کے چہرے سے ٹکرا کر سنسناتی ہوئی باہر آ رہی تھی۔ سبک تھپیڑوں کی ہلکی سی سرسراتی ٹھنڈک اس کے نم چہرے پر پڑتی اور اس کا سارا روآں کھڑا ہو جاتا۔ اس کی مسدود نگاہیں شگاف کے چھوٹے سے چوکھٹ سے گذر کر سامنے بالکل ہی سامنے اس کی دولہن بھابی کو انہماک اور گرسنہ تکے جا رہی تھیں..........

"ارے ؟" مدھم سی ایک آواز دفعتاً ابھری اور ایک لاغر نحیف ہاتھ پردہ سے گذر کر ننھے کے کان پر آپڑا۔ ہاتھ کی انگلیوں نے ٹٹول کر فوراً ہی کان کی لو کو پکڑ لیا۔ انگلیاں باہر تنیں اور ننھا جوف سے بہت زور دیٹ سے علیحدہ کھینچ لیا گیا۔ اس کے دیدے ساکت ہو گئے۔ چہرہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ بھرتی ہوئی سانس پیٹ سے باہر نہ جا سکی اور کھلے ہوئے ہونٹ نہ مل سکے۔

"بدتمیز کہیں کا" — ننھا بھابی جان کو اپنے روبرو پاکر ششدر و خوفزدہ تھا۔ جسم میں جیسے اس کا خون سرد اور ہر عضو معطل ہو گیا۔ بڑی بھابی کی سیاہ گول آنکھیں بڑی ڈراؤنی تھیں۔ غصہ سے تنا ہوا چہرہ بھیانک لگ رہا تھا۔

"کیا دیکھ رہا تھا رے"؟ انہوں نے لو کے ساتھ کان کے بالائی حصہ کو بھی زوروں سے اینٹھتے ہوئے آہستہ سے دریافت کیا" بول بدمعاش کہیں کا" مسلن میں پھر تیزی ہوئی اور انگلیوں نے پورا کان موڑا۔ ننھا دم بخود تھا۔ واقعہ کا ناگہانی تغیر اور کوائف کی اچانک نامطابقت کی آویزش اپنی کشاکش سے ان متواتر گوشمالیوں کو ایذا رسانہ بنا سکی۔ تبدیلی حالت کا استعجاب، شک اور ہیبت نے بیک وقت ننھے کے دل و دماغ میں مختلف اثرات کا ہنگامہ برپا کر دیا۔ چند لمحوں تک وہ ذہنی طور پر لذت اور اذیت کے اس کنارے اور اس کنارے کے درمیان بھٹکتا رہا، اور متضاد اثرات کی گھماگھمی میں کوئی واحد اثر قبول کرنے سے قطعاً مجبور ۔

بھابی جان نے متعدد بار سختی سے گوشمالی کرتے ہوئے اسے ڈانٹا، اس کے کان مروڑے، طمانچہ لگایا اور سر پر ایک تھپڑ مارتے ہوئے برآمدہ سے باہر

نکال دیا " ٹھہر آج تجھے دلہن سے پٹواتی ہوں "۔ انہوں نے جاتے ہوئے
میں بھی اسے ایک ہچکولا دیا۔ ننھے نے یہ بات سنی، اور چلتے ہوئے بھی اس
کی گونج پھر اس کے کانوں میں آ گئی۔ " ٹھہر آج تجھے دلہن سے پٹواتی ہوں "۔
کانوں میں یہ بات جیسے مسلسل بجنے لگی۔ جس کا کرخت آہنگ ننھے کو اذیت
دینے لگا ——— " دولن بھابی سے اس کو سزا ملے گی ——— اسے اچانک
احساس ہوا کہ اس سے ایک جرم سرزد ہوا ہے جس کی سرزنش بڑی بھابی
کی گوشمالی نہ تھی، بلکہ اس سے بھی زیادہ سخت، زیادہ شدید اور زیادہ
ایذا رساں وہ اندوہناک انفعال انگیز بات تھی، جو نہ معلوم کس طرح
اور کیسے دولن بھابی سے اس کو بطور سزا دلائی جائے گی۔ وہ مغموم اور
سنجیدہ ہو گیا۔ ندامت، ملال، تفکر اور بے کلی نے اسے ہر طرف سے
گھیر لیا۔ دبے دبے پاؤں سے وہ امرود کے پاس سے گزرتا ہوا غسل
خانے کی طرف قدم بڑھانے لگا ——— اُف اس کی دولن بھابی کو یہ
بات سُن کر کتنی تکلیف ہوگی ——— اپنی غلطی اور اعتراف جرم پہ اب اس
کا اضطراب سرعت سے بڑھنے لگا ——— دولن بھابی! اس کی تہیی
دولن بھابی ———!! ان کو کتنی نفرت ہو جائے گی۔ انہیں کتنا دُکھ
ہوگا ——— بڑی بھابی کہیں گی، دولن ذرا اپنے ننھے کی بات سنو ———
اُف! اسے جان کر ان کو کتنی نفرت ہو جائے گی!!، ذرا اچھی طرح ان
کی خبر لو...... اور دولن بھابی یہ بات سُن کر نہ جانے کیا کریں گی......
...... اور کیا کہیں گی ...... کان اینٹھیں گی ...... ماریں گی

...... یا ...... یا اس سے بولنا بند کر دیں گی ـــ مضطرب، مضمحل، ہراساں ننھا دل ہی دل میں یہ تمام باتیں خیال کر کے بے کل ہو گیا، وہ چپ چاپ باورچی خانہ کے پاس پایہ کی اوٹ سے لگ کر اپنی ہونے والی سزا پر غور کرنے لگا ـــ اب کیسے وہ ان کے پاس جائے گا ...... کیوں کر انہیں اپنا چہرہ دکھائے گا ...... بڑی بھابی ضرور اس کی شکایت کریں گی ـ وہ ضرور یہ بات کہہ دیں گی ...... اور ...... دولہن بھابی ضرور اس سے بولنا بند کر دیں گی ـــ اس نے زبان سے اپنے خشک ہونٹ تر کرتے ہوئے ایک دو بار منہ چلایا، تھوک کو گھونٹا اور خاموش کھڑا ہوا سرد سانس بھرنے لگا ـ وہ کتنی دیر تک اپنے سے دور اور آتے والے واقعہ سے نزدیک ہراساں، متفکر اور فراموش اوٹ سے لگا کھڑا رہا ـ

کچھ دیر بھیا جان کے جاتے ہی بڑی بھابی فوراً ان کے کمرے میں گئیں اور تھوڑی دیر میں بہن جان، عمرانہ باجی، امی جان بھی وہاں چلی گئیں ـ پھر بھابی جان کو کمرے سے نکلتے دیکھ کر ننھا اوٹ سے لگا ہوا اور بھی ہراساں ہو گیا ـ اس کا اضطراب بڑھ گیا ـــ اب بڑی بھابی اس کو پکڑ کر لے جائیں گی ـــ خوف نے ننھے کے جسم کو سہارتے ہوئے اسے پایہ سے اور بھی سٹا دیا اور چوری طرح چھپا ہوا ذری سی گردن نکال کر بڑی بھابی کو دیکھنے لگا ـ وہ کمرے سے نکل کر تونت کے پاس سے گذرتی دالان میں چلی گئیں ـ ننھے نے ایک بار پھر گہری سانس لے کر اپنا تھوک گھونٹا ـ چند منٹوں کے بعد آرزو کی ماں بھی چھوٹے کمرے سے نکل کر شاہینہ کو گود میں لئے

دولہن بھابی کے کمرے میں چلی گئیں اور ممی جان باہر آگئیں۔ انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے برآمدے سے ننھے کو پکارا۔ ان کی پکار اس کے کان کے پردے سے ٹکرائی، وہ چپ رہا۔ ممی جان نے پھر پکارا۔ ننھا صرف کسمسا گیا اور ممی جان نے جب برآمدے سے اُتر کر امرود کے پاس آکر ننھے کو زور سے پکارا! تو اس کے جامد قدم یکایک اُٹھ گئے اور وہ پایہ کی اوٹ سے باہر نکل آیا۔ ممی جان نے اُسے دیکھتے ہوئے کہا "جاؤ تمہیں دُلہن بلا رہی ہیں"۔ ننھے نے انہیں ایک نظر دیکھا اور نہایت ہی ہلکے قدموں سے برآمدہ کی طرف رُخ کیا۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اس کو ایسا معلوم ہوا کہ اس کا دل بالکل اس کے کانوں کے قریب چلا آیا ہے، جس کی تیز آواز وہ بالکل صاف سُن رہا ہے، مغموم، متفکر، ملول اور ہراساں پُراسرار طاقت کے زیر اثر وہ کشاں کشاں برآمدے کے نزدیک آگیا۔ "اجی ننھے میاں" کمرے کے اندر سے آرزو کی ماں کی پکار پھر اس کے دماغ پر کھٹ سے لگی۔ وہ خاموش برآمدہ پر چڑھ گیا۔

"بلایا نہ جا رہے جی؟" کمرے سے آواز دوبارہ آئی۔ وہ چلنے لگا۔ احساس جُرم، شرمندگی و ندامت، سرزنش کا ہراس و خوف اور ذلت و تحقیر کا صدمہ اس کی مختصر سی محدود دنیا، فکر و فہم پر متواتر حملہ کر کے اس کی ننھی سی شخصیت کو مسلسل لرزا رہا تھا۔ وہ کانپتا، گھبراتا، دھڑکتا اور دُکھ پاتا ہوا پردے کے پاس آگیا۔ "ننھے"؟؟ دولہن بھابھی کی آواز آئی۔ آواز نے شدّت احساس شرمندگی اور ذلت کو ناگہانی مسلتے ہوئے اسے ٹکٹکی مبہوت و مرعوب

کر دیا۔ پردہ ہٹا کر یہ اندر آ گیا۔ "ننھے" دولن بھابی نے بہت سنجیدہ
بن کر پوچھا۔ سب لوگ کمرے میں موجود تھیں۔ دولن بھابی نے اسے
دیکھ کر کہا "اِدھر آؤ" ان کی صورت دیکھ کر اس کی دہشت اُبل پڑی
کہ اب وہ اس کی مرمت کریں گی۔ وہ بالکل ساکت تھا۔ استعجاب
میں ڈوبا، خوف سے لرزہ بر اندام گھبرائی ہوئی نظروں سے وہ دولن
بھابی کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ دولن بھابی کی صورت ابھی تک ویسی ہی
سنجیدہ تھی۔ آہستہ سے ہاتھ کے اشارے جب انہوں نے اسے اپنے قریب
بلایا تو ننھا کے پیر ڈگمگانے لگے۔ اس کا سر ایک دم ہلکا ہو گیا اور آنے
والی سزا کے سحر انگیز زلزلوں سے ڈگتا ہوا وہ ان کے قریب پہنچ گیا۔ ان
سے فاصلہ تھوڑا دور رہا تھا، مگر صرف اتنا ہی جتنا بڑی بھابی کے لمبے
ہاتھ اس کے کانوں کو چھو لیتے اور فوراً ایک کان پکڑ کر زور سے اسے اپنے پاس
کھینچ لاتے۔ دولن بھابی نے اپنے ہاتھ اُٹھائے، اور دونوں ہاتھ ایک
ساتھ ——— ننھے کا دل بہت زور سے کانپا، وہ انتہائی دہشت سے
دولن بھابی کے چہرے کو دیکھنے لگا، جو ناگہاں بدل گیا تھا۔ ان کے
اُٹھتے ہوئے دونوں ہاتھوں شانوں سے گذرتے اس کے دونوں کانوں
تک پہنچے۔ چوڑیاں بجیں اور انگلیاں ہلیں ——— "میرے ننھے بھائی!
کل میں جا رہی ہوں۔" ہاتھ اس کے کانوں تک آ کر ہی رک گئے، اور یہ کہتے
ہوئے دولن بھابی نے انگلیوں سے اس کے رخسار کو چوم لیا۔ ننھا کی ساری
دہشت اور سارا خوف بارود جیسا بھک سے اڑ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں

سے اپنے گال سے لگی ہوئی دولن بھابی کی انگلیوں کو پکڑ لیا اور ان کی
گود میں سر رکھ کر پھوٹ کر رونے لگا ـــــ !!

"نیوروا گو کرلوں جو ان میں گود یا کھلا کے" مسکراتے ہوئے
پاس مسہری سے لگی آرزو کی ماں نے کہا ۔ بہن جان اور عمرانہ باجی بھی ہنس
پڑیں اور دولن بھابی نے شرما کر جلدی سے ننھے کو اپنی گود میں کھینچ لیا ۔

•

عرض ناشر

یہ خاکے ۴۵-۱۹۴۶ میں لکھے گئے تھے۔ ۴۶-۴۷ میں یہ بہار کے ایک ہفتہ وار رسالہ نوجوان میں جستہ جستہ شائع ہوئے۔ اس زمانہ میں کتابی صورت میں ان کی اشاعت کا اعلان مختلف مکتبوں نے کیا تھا، مگر یہ مجموعہ شائع نہ ہو سکا ——— اردو سوسائٹی آج اسے پیش کر رہی ہے۔

یہ خاکے، جیسا اوپر مذکور ہے، پانچ چھ برس پہلے لکھے گئے تھے۔ رفتار زمانہ نے افراد خاکہ کی شخصیت و حالت پر اپنا اثر چھوڑا ہے اور ان میں کم و بیش تبدیلیاں بھی واقع ہوئی ہیں، مگر ادارہ کی فہمائش کے باوجود خاکہ نگار نے ان کو عینک سے دیکھنا پسند نہ کیا۔ موصوف کا خیال ہے کہ ان افراد کی سیرت و انفرادیت میں کسی تبدیلی کا گذر نہیں۔

تمام افسانوں کا انتخاب، بجز مانپوری اور آلم، خود مؤلف نے کیا ہے۔ ان دو افسانہ نگاروں نے اپنا افسانہ خود پسند کیا ہے۔ انتخاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر افسانہ افسانہ نگار کے فن کی پوری نمائندگی کر سکے۔

تصحیح کے باوجود کتاب میں غلطیاں رہ گئی ہیں، ادارہ اس کے لیے معذرت خواہ ہے۔

ہم انہیں جلد منظرِ عام پر لا رہے ہیں

(۱)

نئے پھول — افسانہ — ح۔م۔ اسلم عظیم آبادی

(۲)

جانے پہچانے — خاکے — مُسلم اورسائی

(۳)

نثری ادب کے چند اصناف — مقالے — سیّد محمد حسنین

(۴)

تنقیدِ نو — مقالے — سیّد محمد ظہیر الحسن

(۵)

تجربیات — سیّد محمد حسنین

اُردو سوسائٹی، پٹنہ